فہرست

شذرات	روزے کے اثرات	منظور الحسن	۲
قرآنیات	البقرہ (۲: ۲۲۴-۲۲۷)	جاوید احمد غامدی	۹
معارفِ نبوی	دبا، حنتم، نقیر اور مزفت سے ممانعت۔ نشہ آور اشیا سے ممانعت	زاویۂ فراہی	۱۳
	تکمیل ایمان۔ مرجئہ اور قدریہ کا انجام	طالب محسن	۲۰
دین و دانش	قانون معاشرت (۱۴)	جاوید احمد غامدی	۲۷
حالات و وقائع	سیرت النبی	محمد اسلم نجمی	۳۱
	مسئلۂ افغانستان	سلیم صافی	۳۹
اصلاح و دعوت	متفرق مضامین	ریحان احمد یوسفی۔ محمد بلال ڈاکٹر وسیم اختر مفتی	۵۵
تبصرۂ کتب	''تحریک مجاہدین، جنگ بالاکوٹ کے بعد''	عبد الرؤف	۶۵
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۶۹

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روزے کے اثرات

اس گھڑی ہم جی رہے ہیں، مگر اگلی کسی گھڑی ہمیں مر جانا ہے۔ جس طرح یہ جینا سدا کا جینا نہیں ہے، اسی طرح وہ مرنا بھی سدا کا مرنا نہیں ہوگا۔ ایک دن ہم اسی روح و بدن کے ساتھ ایک دوسری دنیا میں کھڑے ہوں گے۔ پروردگار کا فرمان ہے کہ: ''اس دن ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ کتنے چہرے اس دن روشن ہوں گے، ہنستے ہوئے ہشاش بشاش! اور کتنے چہرے ہوں گے کہ ان پر خاک اڑتی ہوگی، سیاہی چھا رہی ہوگی۔'' اس روز آخری عدالت لگے گی۔ ہم سب کے اعمال نامے کھولے جائیں گے۔ ان اعمال ناموں میں ''جس نے ذرہ برابر بھلائی کی ہے، وہ بھی اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہے، وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔'' اور پھر جن کی فہرست اعمال میں نیکیاں زیادہ ہوں گی، وہ کامیاب اور جنت کے مستحق ٹھہریں گے اور جن کی فہرست اعمال میں گناہ زیادہ ہوں گے وہ مجرم اور جہنم کے سزاوار قرار پائیں گے۔ اس موقع پر ان مجرموں میں سے ہر ''مجرم کہے گا کہ اے کاش، وہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے، اپنے بیٹوں کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے خاندان کو جو اسے پناہ دیتا رہا اور اس زمین کے ہر شخص کو فدیہ میں دے دے، پھر اپنے آپ کو اس سے چھڑا لے''، مگر وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔ آخرت کا گھر بس انھی لوگوں کے لیے بہتر قرار پائے گا جنھوں نے دنیا کی زندگی نفس کی خواہشوں پر قابو رکھتے ہوئے اور اپنے پروردگار کے حضور میں پیشی سے ڈرتے ہوئے گزاری ہوگی، گویا انھوں نے تقوے کی راہ اختیار کی ہوگی اور عمر بھر اپنے پروردگار کی اس بات کو مشعل راہ بنایا ہوگا کہ:

''دار آخرت بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں۔'' (الاعراف ۷:۱۶۹)

ہم میں سے ہر شخص اس دن جہنم کے دردناک عذاب سے بچنا چاہتا ہے اور دار آخرت میں بہتری کا طلب گار ہے۔ مگر ہمیں یہ بات جان رکھنی چاہیے کہ دار آخرت میں کامیابی اور بہتری کا صرف اور صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ راستہ تقویٰ ہے۔ ہمیں اس پر گام زن ہونے کے لیے ہر ممکن طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے موثر طریقہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

روزہ ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

''ایمان والو، تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔''

(البقرہ ۲: ۱۸۳)

روزہ ہمارے عمل، ہمارے اخلاق اور ہماری روح پر ایسے اثرات مرتب کرتا ہے کہ ہمارے لیے شیطان کی ترغیبات اور نفس کے داعیات کے باوجود تقوے کی نشوونما ممکن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رمضان کے دوران میں ہمیں اس بات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ آیا ہم روزے کے ان اثرات سے فی الواقع فیض یاب ہو بھی رہے ہیں یا نہیں۔ اگر روزے ہمارے اندر تقوے کو پروان نہیں چڑھا رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے کھانے پینے کے اوقات میں تبدیلی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں کیا۔ روزہ ہماری عملی، اخلاقی اور روحانی زندگی پر جو اثرات قائم کرتا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ نمازوں میں سرگرمی

اپنے مالک کے حضور میں سربسجود ہونا انسان کی معراج ہے۔ نماز اصل میں، ان نعمتوں پر شکر کا اظہار ہے جو پروردگار نے انسان کو کسی استحقاق کے بغیر دی ہیں، اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ دنیا کا کارساز صرف اور صرف وہی ہے، اس بات کا اقرار ہے کہ ہماری محبت کا مرکز حقیقی وہی ہے، اس امر کی تائید ہے کہ اطاعت کا مرجع اسی کی ذات ہے اور اس مسلمے کا ادراک ہے کہ جو کچھ ملے گا اسی کے در سے ملے گا۔ دوسرے الفاظ میں نماز انسان کی طرف سے بندگی رب کا بھرپور اظہار ہے۔ رمضان میں چونکہ پورا ماحول اللہ تعالیٰ کی عبادت میں سرگرم ہوتا ہے، اس لیے ہر شخص کے اندر عبادت کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ یہ مہینا ہمیں یہ موقع فراہم کرتا ہے ہم رضاے الٰہی کی جستجو میں نماز کو اپنے معمولات کا سب سے اہم حصہ بنائیں۔ اس ضمن میں ہمیں سہ جہتی منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔ ایک یہ کہ اس کی حتی المقدور کوشش کی جائے کہ فرض نمازیں کسی حال میں قضا نہ ہوں اور مسجد میں باجماعت نماز کا التزام کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ فرض نمازوں کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ نوافل ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ تیسرے یہ کہ تہجد کی نماز کو اس مہینے میں اپنا معمول بنا لیا جائے۔ اگرچہ اس بات کی روایت پڑ گئی ہے کہ رمضان میں تہجد کی نماز عشا کے ساتھ ہی تراویح کے نام سے پڑھ لی جاتی ہے، مگر اس کا اصل طریقہ یہ ہے کہ اسے تنہائی میں اور رات کا کچھ حصہ گزر جانے کے بعد پڑھا جائے۔ رمضان میں اس کی اس قدر اہمیت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص رمضان کی راتوں میں اپنے ایمان کو قائم رکھتے ہوئے ثواب کی نیت سے (تہجد کی نماز پڑھنے کے لیے) کھڑا رہا، اس کے تمام اگلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔'' (بخاری، رقم ۱۸۸۵)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۲۔مطالعۂ قرآن

رمضان میں مطالعۂ قرآن کی اہمیت دو پہلوؤں سے ہے۔ایک یہ کہ یہ وہ بابرکت مہینا ہے جس میں قرآنِ مجید نازل ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''یہ رمضان کا مہینا ہے جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ۔''(البقرہ۲: ۱۸۵)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ماہِ رمضان کی قرآنِ مجید سے خاص مناسبت ہے۔

دوسرے یہ کہ اس مہینے میں خدا کی بات سننے اور سمجھنے کی طلب ہر دل میں پیدا ہوتی ہے اور خلوت میسر ہونے اور روزمرہ مصروفیات میں کمی کی وجہ سے فہمِ قرآن کا پورا موقع میسر آ جاتا ہے۔اس موقعے سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآنِ مجید کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کرنی چاہیے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ تلاوت سے مراد قرآنِ مجید کو بے سوچے سمجھے پڑھنا نہیں ہے، بلکہ نہایت غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کرنا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۳۔انفاق

اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا انفاق ہے۔آخرت کی کامیابی کے حوالے سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بہت اہمیت ہے۔قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

''ہم نے جو کچھ تمھیں بخشا ہے، اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت آ دھمکے۔ پھر وہ حسرت سے کہے کہ اے رب، تو نے مجھے کچھ اور مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ کرتا اور نیکوکاروں میں سے بنتا۔''(المنافقون۶۳: ۹۔۱۰)

گویا اللہ کی یاد کو قائم رکھنے، مال و اولاد کے فتنوں سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اس کے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کیا جائے۔

رمضان میں اس نیکی کا بھرپور اظہار ہونا چاہیے۔اس موقع پر اپنے اعزہ پر، اپنے ہمسائیوں پر، اپنے ہم وطنوں پر اور ناداروں اور ضرورت مندوں پر جس قدر ممکن ہو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے۔رمضان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انفاق کے حوالے سے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بہت سخاوت کرتے تھے۔آپ کی سخاوت چلتی ہوئی ہوا سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔'' (مشکوٰۃ، رقم ۱۹۹۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو عام حالات میں بھی سب سے زیادہ فیاض تھے، لیکن رمضان میں تو آپ سراپا جود و

کرم بن جاتے۔'' (متفق علیہ)

رمضان میں انفاق کی ایک صورت روزہ دار کو روزہ افطار کرانا بھی ہے۔ حضرت زید بن خالد جہنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

''جس نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا، اس کے لیے روزہ دار کے برابر اجر ہے اور اس سے روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔'' (ترمذی، کتاب الصوم)

۴۔ نفس پر قابو

شیطان انسان پر جن راستوں سے زیادہ تاخت کرتا ہے وہ بطن اور فرج ہیں۔ اگر انسان اپنے پیٹ اور اپنی شرم گاہ کے تقاضوں کو بے لگام نہ ہونے دے تو وہ بیشتر برائیوں سے محفوظ رہتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''جو شخص ان چیزوں کے بارے میں مجھے ضمانت دے سکے جو اس کے دونوں گالوں اور دونوں ٹانگوں کے درمیان ہیں، میں اس کے لیے جنت کا ضامن بنتا ہوں۔'' (متفق علیہ)

روزے کے دوران میں کھانے پینے پر پابندی ہوتی ہے۔ فضول گفتگو سے پرہیز بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس وجہ سے زبان کے چٹخارے اور اس کی فتنہ انگیزیاں بند ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح انسان کی حیوانی ضروریات پر بھی ایک لمبے وقت کے لیے پابندی لگ جاتی ہے۔ چنانچہ اس دوران میں بے راہ روی سے بچے رہنے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی نہ ہونے کی صورت میں روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص شادی کرنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ نکاح کرے اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو، وہ روزہ رکھے۔'' (بخاری، رقم ۱۷۸۷)

۵۔ حسن کلام

وہی کلام اچھا اور موثر ہوتا ہے جو شایستہ ہو، حیا کا آئینہ دار ہو اور جھوٹ سے پاک ہو۔ روزے کا زیادہ وقت کم گوئی اور پروردگار کے ساتھ مناجات میں گزرنا چاہیے، لیکن اگر گفتگو کا موقع بھی ہو تو اسے پاکیزہ ہونا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کے دوران میں فحش گفتگو کرنے اور جھگڑنے سے منع فرمایا ہے:

''روزہ دار کو چاہیے کہ وہ روزے میں فحش باتیں نہ کرے، نہ بدتمیزی کرے، اگر کوئی شخص اس سے جھگڑے تو اسے کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔'' (بخاری، رقم ۱۷۸۶)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اسی طرح آپ کا ارشاد ہے:

''جو شخص (روزہ رکھ کر) جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔'' (بخاری، رقم ۱۷۸۵)

۶۔صبر و برداشت

روزے کی حالت میں روزہ دار صبر و برداشت کا پیکر بن جاتا ہے۔ جب اس کے سامنے کھانا آتا ہے تو بھوک کے باوجود وہ اس سے منہ پھیر لیتا ہے۔ جب کوئی اس سے جھگڑا کرتا ہے تو وہ یہ کہہ کر گریز کر لیتا ہے کہ میں روزے سے ہوں۔

اللہ کے حکم کی پیروی میں انسان کے اس صبر و ثبات پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ ام عمارہ بنت کعب بیان کرتی ہیں:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لائے تو انھوں نے آپ کے لیے کھانا منگوایا۔ کھانا آیا تو آپ نے فرمایا کہ تم بھی کھاؤ تو انھوں نے کہا کہ میں روزے سے ہوں۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس وقت روزہ دار کے پاس کھانا کھایا جائے، تو فرشتے اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ کھانے سے فارغ ہو جائے۔''

(مشکوٰۃ، رقم ۱۹۸۱)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

روزہ انسان کی ایسی تربیت کر دیتا ہے کہ وہ بڑی سے بڑی آزمایش کو بھی خندہ پیشانی سے سہ لیتا ہے۔ تربیت کے اسی پہلو کی وضاحت میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہی روزہ ہے جو مذہب نے انسانوں کی ظاہری و باطنی تربیت کے لیے تجویز فرمایا ہے اور مقصود اس سے ان کی صلاحیت کار کو ضعیف کرنا نہیں ہے، بلکہ اس صلاحیت کار کو صبر اور تقویٰ کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ مستحکم کر دینا ہے تاکہ انسان حق کی مخالف طاقتوں کے مقابل میں، خواہ یہ طاقتیں شیطانی ہوں یا انسانی، جہاد کا اہل ہو سکے۔ قرآن اور حدیث پر نگاہ رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ روزے کے بنیادی مقصد دو بیان کیے گئے ہیں۔ تقویٰ اور صبر۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی زندگی کے ہر مرحلہ میں اور ہر قسم کے حالات میں اپنے نفس کو حدود الٰہی کا پابند رکھے۔ صبر یہ ہے کہ اس راہ میں خارج سے یا اس کے باطن سے جو مشکلات و موانع بھی سر اٹھائیں۔ ان کا پورے عزم و جزم کے ساتھ مقابلہ کرے اور ان کے آگے سپر انداز نہ ہو۔ یہ جہاد زندگی بھر کا جہاد ہے۔ رمضان کے مہینے میں ہر مسلمان اسی جہاد کی ٹریننگ حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ اس کا امکان ہے کہ نئے نئے بھرتی ہونے والوں پر اس ٹریننگ کا فوری اثر اضمحلال اور ضعف کی شکل میں ظاہر ہوتا ہو۔ لیکن دیکھنے کی چیز یہ فوری اثر نہیں، بلکہ اس کا مستقل اثر ہے۔ اس کا مستقل اثر یقیناً، اس کو صحیح طور پر برتنے کی شکل میں، یہی ہونا چاہیے کہ انسان کی بلادت کم ہو، اس کی روح قوی ہو، اس کا دل توانا ہو، اس کی قوتِ ارادی مضبوط ہو، اس کی قوت برداشت بڑھ جائے، وہ جہاد زندگانی اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پوری طرح تیار ہو جائے۔''

(تدبر قرآن ۱/ ۴۶۲)

۷۔ اللہ سے تعلق

روحِ انسانی کی فطرت رجوع الی اللہ ہے، مگر نفس کی خواہشات اور شہوات اس کی فطرت کو مجروح کرتی رہتی ہیں۔ روزہ نفس کے میلانات پر پابندی عائد کر کے روح کو اس کے فطری رجحان کے مطابق پروان چڑھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بندہ دنیا سے کٹ کر اللہ کی رضا جوئی کے لیے سرگرمِ عمل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزے کی عبادت اللہ تعالیٰ کی محبوب ترین عبادت ہے اور اللہ نے اس کا خاص اجر بیان فرمایا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آدمی کا ہر نیک عمل اس کے کام کا ہے، مگر روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ قسم اس کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی بو سے بہتر ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی روزہ افطار کرتے ہوئے حاصل ہوتی ہے اور دوسری خوشی اس وقت حاصل ہو گی جب وہ اپنے مالک سے ملے گا اور روزے کا اجر دیکھ کر خوش ہو گا۔'' (بخاری، رقم ۱۷۸۶)

_____ منظور الحسن

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۴۶)

(گزشتہ سے پیوستہ)

وَلَا تَجۡعَلُوا اللّٰهَ عُرۡضَةً لِّاَيۡمَانِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡا وَ تَتَّقُوۡا وَ تُصۡلِحُوۡا بَيۡنَ النَّاسِ، وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغۡوِ فِيۡۤ اَيۡمَانِكُمۡ،

(عورتوں سے متعلق بعض دوسرے معاملات بھی ہیں، اِنھیں بھی سمجھ لو) اور اپنی[۵۹۵] قسموں کے لیے اللہ کے نام کو دوسروں سے حسن سلوک کرنے اور حدود الٰہی کی رعایت کرنے اور لوگوں کے مابین صلح کرانے میں رکاوٹ نہ بناؤ اور (متنبہ رہو کہ) اللہ سمیع و علیم ہے۔ اللہ تمھاری اُن قسموں پر تو تمھیں نہیں پکڑے گا جو تم

[۵۹۵] عورتوں سے نہ ملنے کی قسم کھا لینے کا جو حکم آگے بیان ہوا ہے، یہ اس کی تمہید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی قسم کھانا چونکہ اسے گواہ ٹھیرانا ہے، لہٰذا اول تو کوئی ایسی قسم کھانی نہیں چاہیے جس سے اللہ یا اس کے بندوں کے حقوق تلف ہوتے ہوں، لیکن اس طرح کی قسم اگر اتفاق سے کوئی شخص کھا بیٹھے تو اسے توڑ دینا چاہیے۔ قسم کے حیلے سے دوسروں کی حق تلفی اور نیکی اور تقویٰ اور نصح و خیر خواہی کے کاموں سے گریز کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے۔ اس مضمون کے لیے 'ان تبروا و تتقوا و تصلحوا بين الناس' کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، ان کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر میں اس طرح کی ہے:

''بر، تقویٰ اور اصلاح کے تینوں لفظوں نے یہاں خیر اور نیکی کی تمام اقسام کو جمع کر لیا ہے۔ 'بر' ان تمام نیکیوں پر حاوی ہے جن کا تعلق والدین، رشتہ داروں، مسکینوں، یتیموں اور دوسرے حقوق العباد سے ہے۔ 'تقویٰ' ان نیکیوں پر حاوی ہے

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿٢٢٥﴾ لِلَّذِيْنَ
يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ، فَاِنْ فَآءُوْ ، فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

بے ارادہ کھا لیتے ہو، لیکن وہ قسمیں جو دل کے ارادے سے کھاتے ہو، اُن پر لازماً مواخذہ کرے گا اور (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ بخشنے والا ہے، وہ بڑا بردبار ہے۔[596] (اِس لیے) جو لوگ اپنی بیویوں سے نہ ملنے کی قسم کھا بیٹھیں،[597] اُن کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔ پھر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت

جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور 'اصلاح' سے مراد وہ نیکیاں ہیں جو معاشرے سے تعلق رکھنے والی ہیں۔''

(تدبر قرآن ۱/۵۲۹)

[۵۹۶] یعنی اس طرح کی قسم تو ہر حال میں توڑ دینی چاہیے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس پر مواخذہ نہ ہوگا۔ اللہ ان قسموں پر تو بے شک، نہیں پکڑیں گے جن کا تعلق دل سے نہیں ہوتا اور وہ بغیر کسی ارادے کے محض تکیۂ کلام کے طور پر زبان سے ٹپک پڑتی ہیں، مگر ایسی قسم جو پختہ عزم کے ساتھ اور دل کے ارادے سے کھائی گئی ہے، جس کے ذریعے سے کوئی عہد و پیمان باندھا گیا ہے، جس سے حقوق و فرائض پر کوئی اثر مترتب ہوتا ہے یا وہ خدا کی کسی تحلیل و تحریم پر اثر انداز ہوسکتی ہے، اس پر لازماً پکڑیں گے۔ عام قاعدے کے مطابق اس پکڑ سے بچنے کے لیے آدمی کو توبہ و استغفار کرنی چاہیے، لیکن قرآن نے آگے سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۸۹ میں بتایا ہے کہ توبہ کے ساتھ اس کے لیے کفارہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

[۵۹۷] اس کے لیے اصل میں 'ایـلاء' کا لفظ آیا ہے۔ یہ عرب جاہلیت کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم بیوی سے زن و شو کا تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا لینا ہے۔ اس طرح کی قسم اگر کھا لی جائے تو اس سے بیوی چونکہ معلق ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ چیز عدل و انصاف اور برو تقویٰ کے منافی ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے چار مہینے کی مدت مقرر کر دی ہے۔ شوہر پابند ہے کہ اس کے اندر یا تو بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کر لے یا طلاق دینے کا فیصلہ ہے تو اس کو طلاق دے دے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ عذر معقول کے بغیر بیوی سے ازدواجی تعلق منقطع کر لینا کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس کے لیے اگر قسم بھی کھالی گئی ہے تو اسے توڑ دینا ضروری ہے۔ یہ عورت کا حق ہے اور اسے ادا نہ کرنے پر دنیا اور آخرت، دونوں میں شوہر کو مجرم قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی معاملہ، ظاہر ہے کہ بیوی کا بھی ہوگا۔ وہ بھی کسی معقول وجہ کے بغیر شوہر کے ساتھ یہ تعلق قائم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی۔

رَّحِیۡمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ ، فَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۲۷﴾

ابدی ہے[598]۔ اور اگر طلاق کا فیصلہ کر لیں تو (اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ سمیع و علیم ہے[599]۔ ۲۲۴۔۲۲۷

[۵۹۸] یعنی اگرچہ یہ قسم حق تلفی کے لیے کھائی گئی تھی اور اس طرح کی قسم کھانا کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے، لیکن اصلاح کر لی جائے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دیں گے۔

[۵۹۹] یعنی اگر طلاق کا فیصلہ کر لیا ہے تو اس میں اللہ کا قانون اور اس کے حدود و قیود ہر حال میں پیش نظر رہنے چاہییں۔ اللہ ہر چیز کو سنتا اور جانتا ہے۔ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی ہو گی تو وہ ہرگز اس سے چھپی نہ رہے گی۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دبا، حنتم، نقیر اور مزفت سے ممانعت

[ان روایات کی ترتیب وتدوین اور شرح ووضاحت جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں زاویۂ فراہی کے رفقا معز امجد، منظور الحسن، محمد اسلم نجمی اور کوکب شہزاد نے کی ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.almawrid.org

روی[1] انہ نہی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن الدباء والحنتم والنقیر والمزفت[2]، لا یکون زیتا او خلا[3]، وان یخلط البلح بالزھو[4] وان یخلط التمر بالزبیب والزھو بالتمر[5]۔ وکل مسکر حرام[6]۔

وکان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا لم یجد شیئا ینتبذ لہ فیہ نبذ لہ فی تور من حجارۃ[7]۔

روایت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دبا، حنتم، نقیر اور مزفت[1] (جیسے شراب تیار کرنے والے برتنوں میں مشروب بنانے) سے منع فرمایا سوائے اس کے کہ (ان کا استعمال) روغن زیتون یا سرکہ (بنانے کے لیے) ہو[2]۔ اور اس سے بھی کہ (شراب تیار کرنے کے لیے ان برتنوں میں کچی کھجور) بلح کو (زرد یا سرخ کچی کھجور) زہو میں ملایا جائے یا (پکی ہوئی خشک کھجور) تمر کو (خشک انگور) زبیب میں اور زہو کو تمر میں ملایا جائے[3]۔ (اس لیے کہ) ہر نشہ آور چیز حرام ہے[4]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کے ان برتنوں سے گریز کا عالم یہ تھا کہ آپ) کو اگر نبیذ بنانے کے لیے بھی کوئی اور برتن میسر نہ ہوتا تو (پھر بھی آپ انھیں استعمال نہ فرماتے، بلکہ) پتھر کے برتن میں نبیذ تیار کر لیتے[5]۔

ترجمے کے حواشی

[1] یہ ان خاص برتنوں کے نام ہیں جن میں اہل عرب عام طور پر شراب تیار کرتے تھے۔

[2] ان برتنوں کی ممانعت اصل میں ان میں تیار ہونے والی شراب کی ممانعت ہے۔ ان میں روغن زیتون اور سرکہ بنانے کی اجازت سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا استعمال اصلاً ممنوع نہیں ہے۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خاص موقع پر سد ذریعہ کے اصول کے تحت یہ حکم دیا ہے اور اس کا مقصد شراب کے خبث کو نہایت درجہ واضح کرنا اور مسلمانوں کو اس کی ادنیٰ آلایش سے بھی محفوظ رکھنا ہے۔ چنانچہ بعد میں جب آپ نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں پر شراب کی خرابی پوری طرح واضح ہوگئی ہے اور برتنوں کی کمی کی وجہ سے انھیں کچھ مشکل بھی پیش آ رہی ہے تو آپ نے ان کے عام استعمال کی اجازت دے دی۔ ذیل کی روایات سے یہی بات واضح ہوتی ہے:

انتبذوا فیما رایتم، واجتنبوا کل مسکر۔ (نسائی، رقم ۲۰۰۶)

''تم جس (برتن) میں چاہو نبیذ بنا سکتے ہو۔ البتہ ہر نشہ آور چیز سے پرہیز کرتے رہو۔''

وامرتکم بظروف وان الوعاء لا یحل شیاء ولا یحرمہ فاجتنبوا کل مسکر۔ (احمد، رقم ۲۱۹۶۰)

''میں نے تمھیں بعض برتن استعمال کرنے سے روکا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کوئی برتن کسی چیز کو حلال یا حرام نہیں بناتا۔ چنانچہ اصل بات یہ ہے کہ (ان برتنوں سے نہیں، بلکہ ان میں تیار ہونے والی) ہر نشہ آور چیز سے اجتناب کرو۔''

فقال اعرابی: انہ لا ظروف لنا فقال اشربوا ما حل واجتنبوا ما اسکر۔ (ابوداؤد، رقم ۳۲۱۴)

''ایک بدو نے کہا کہ (ان برتنوں کے علاوہ) ہمارے پاس کوئی اور برتن نہیں ہیں تو آپ نے فرمایا کہ جو حلال ہے اسے پیو اور جو نشہ آور ہے، اس سے اجتناب کرو۔''

[3] عرب شراب بنانے کے لیے عام طور پر یہی طریقے اختیار کرتے تھے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

’البلح‘ بالکل ابتدائی مرحلے کی سبز کچی کھجور کا نام ہے اور ’الزھو‘ پکنے کی طرف مائل زرد یا سرخ کچی کھجور کو کہتے ہیں۔ عربی لغت ’’مختار الصحاح‘‘ میں کھجور کے مختلف مراحل کے یہ نام درج ہیں: ’الطلع‘، ’الخلال‘، ’البلح‘، ’البسر‘، ’الرطب‘، ’التمر‘۔ ’التمر‘ کا لفظ پکی ہوئی خشک کھجور کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ’الزبیب‘ خشک انگور کو کہا جاتا ہے۔

[۴] قرآن مجید نے شراب نوشی کو نجس شیطانی عمل قرار دیا ہے اور اس سے منع فرمایا ہے۔ بعض دوسرے شیطانی افعال کے ساتھ اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

’’ایمان والو، یہ شراب اور جوا اور تھان اور قسمت کے تیر، سب گندے شیطانی کام ہیں، اس لیے ان سے الگ رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔‘‘ (المائدہ ۵: ۹۰)

[۵] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ ان اشیا سے دور رہنا چاہیے جو عرف عام میں برے کاموں سے وابستہ ہوں۔

متن کے حواشی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ مسلم کی روایت، رقم ۱۹۹۵ ہے۔ کچھ فرق کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے: نسائی، رقم ۵۱۷۰، ۵۱۷۱، ۵۵۴۸، ۵۵۴۹، ۵۵۵۷، ۵۵۸۹، ۵۵۹۰، ۵۶۲۳، ۵۶۳۱، ۵۶۳۲، ۵۶۳۳، ۵۶۳۴، ۵۶۳۶، ۵۶۳۷، ۵۶۳۸، ۵۶۴۰، ۵۶۴۳، ۵۶۴۴، ۵۶۴۵، ۵۶۴۷، ۵۶۴۸، ۵۶۴۹، ۵۶۷۸۔ ابوداؤد، رقم ۳۶۹۰، ۳۶۹۷۔ ابن ماجہ، رقم ۳۴۰۱، ۳۴۰۲، ۳۴۰۳، ۳۴۰۴۔ احمد ابن حنبل، رقم ۱۸۵، ۳۶۰، ۹۶۳، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۲۴۹۹، ۲۶۰۷، ۲۶۵۰، ۲۷۶۹، ۲۷۷۲، ۳۰۸۶، ۳۱۵۷، ۳۱۶۶، ۳۳۰۰، ۴۹۱۴، ۵۰۱۵، ۵۲۲۴، ۵۴۹۴، ۶۰۱۲، ۷۷۳۸، ۹۳۴۳، ۱۰۵۱۷، ۱۱۸۶۷، ۱۱۸۶۸، ۱۱۸۶۹، ۱۱۸۷۰، ۱۰۲۹۲، ۱۴۸۸۶، ۱۵۱۰۲، ۱۵۱۶۲، ۱۵۱۸۲، ۱۶۸۴۱، ۱۶۸۵۳، ۱۷۸۹۳، ۱۷۸۹۵، ۱۷۸۹۷، ۱۹۸۵۱، ۱۹۹۹۴، ۲۰۵۹۶، ۲۰۶۵۷، ۲۰۶۶۴، ۲۴۰۷۰، ۲۴۲۴۷، ۲۴۵۵۱، ۲۴۷۰۰، ۲۴۷۱۵، ۲۴۸۵۸، ۲۴۹۶۶، ۲۵۰۴۴، ۲۵۴۲۹، ۲۵۴۳۶، ۲۶۰۹۹، ۲۶۱۱۴، ۲۶۷۱۵، ۲۶۸۶۶، ۲۶۸۶۷۔ دارمی، رقم ۲۱۱۲۔ ابن حبان، رقم ۵۳۷۹، ۵۳۹۷، ۵۴۰۱، ۵۴۰۳، ۵۴۰۵، ۵۴۰۶، ۵۴۰۷، ۵۴۰۸، ۵۴۱۱۔ بیہقی، رقم ۱۷۱۴۶، ۱۷۲۴۵، ۱۷۲۴۶، ۱۷۲۵۲، ۱۷۲۵۳، ۱۷۲۵۴، ۱۷۲۵۵، ۱۷۲۵۶۔ عبدالرزاق، رقم ۱۶۹۲۶، ۱۶۹۲۷، ۱۶۹۳۳، ۱۶۹۳۴، ۱۶۹۳۵، ۱۶۹۳۷، ۱۶۹۶۰، ۱۶۹۶۲، ۱۶۹۶۳، ۱۶۹۶۴، ۱۶۹۶۵، ۱۶۹۶۶، ۱۶۹۶۸۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۲۳۷۷۹، ۲۳۷۸۰، ۲۳۷۸۱، ۲۳۷۸۲، ۲۳۷۸۵، ۲۳۷۸۶، ۲۳۷۸۷، ۲۳۷۸۸، ۲۳۷۸۹، ۲۳۷۹۰، ۲۳۷۹۲، ۲۳۷۹۳، ۲۳۷۹۴، ۲۳۷۹۵، ۲۳۷۹۶، ۲۳۷۹۸، ۲۳۸۰۲، ۲۳۸۰۴، ۲۳۸۰۵، ۲۳۸۰۷، ۲۳۸۰۸، ۲۳۸۰۹، ۲۳۸۱۰، ۲۳۸۱۱، ۲۳۸۲۰، ۲۳۸۲۱، ۲۳۸۶۹، ۲۳۸۷۰، ۲۳۸۷۱، ۲۳۸۷۲، ۲۴۶۶۱۔ ابویعلیٰ، رقم ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۴۴۵۰، ۶۰۷۷، ۶۱۲۸۔

۲۔بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۵۶۳۱ میں 'دبا'، 'حنتم'، 'نقیر' اور 'مزفت' کے بعد 'القرع' کا لفظ آیا ہے۔ نسائی ہی کی ایک روایت، رقم ۵۶۴۵ کے مطابق یہ لفظ 'الدبا' کے مترادف کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ یہاں 'و النقیر' کا اضافہ نسائی، رقم ۵۵۹۰ کی بنا پر ہے۔ ابن حبان، رقم ۵۴۰۳ کے مطابق 'نبیذ الجر' کے الفاظ بھی ممنوعہ اشیا کے طور پر آئے ہیں۔

۳۔'لا یکون زیتا او خلا' (سوائے اس کے کہ ان کا استعمال روغن زیتون یا سرکہ بنانے کے لیے ہو۔) کے الفاظ نسائی، رقم ۵۶۳۶ سے لیے گئے ہیں۔

٤۔'و ان یخلط البلح بالزھو' (اور اس سے بھی کہ بلح کو زہو میں ملایا جائے) کے الفاظ مسلم، رقم ۱۷ سے لیے گئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۵۵۴۹ میں یہی بات 'و ان یخلط التمر بالزبیب والزھو بالتمر' (اور اس سے بھی کہ تمر کو زبیب میں اور زہو کو تمر میں ملایا جائے) کے الفاظ میں نقل ہوئی ہے، جبکہ بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۵۵۵۷ میں یہ الفاظ آئے ہیں: 'و عن البسر والتمر ان یخلطا و عن الزبیب والتمر ان یخلطا و کتب الی اھل حجر ان لا تخلطوا الزبیب والتمر جمیعا۔' (آپ نے منع فرمایا کہ بسر یعنی گدر کھجور کو تمر میں اور زبیب کو تمر میں ملایا جائے۔ آپ نے اہل حجر کو لکھا کہ وہ زبیب اور تمر کو آپس میں نہ ملائیں)۔

۵۔'و ان یخلط التمر بالزبیب والزھو بالتمر' (اور اس سے بھی کہ تمر کو زبیب میں اور زہو کو تمر میں ملایا جائے) کے الفاظ نسائی، رقم ۵۵۴۹ سے لیے گئے ہیں۔

٦۔'و کل مسکر حرام' (ہر نشہ آور چیز حرام ہے) کا جملہ نسائی، رقم ۵۵۹۰ سے لیا گیا ہے۔

۷۔متن کے آخر میں درج یہ حصہ: 'و کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا لم یجد شیاء ینتبذ لہ فیہ، نبذ لہ فی تور من حجارۃ' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر نبیذ بنانے کے لیے بھی کوئی اور برتن میسر نہ ہوتا تو پتھر کے برتن میں نبیذ تیار کر لیتے) مسلم، رقم ۱۹۹۸ سے لیا گیا ہے۔

نشہ آور اشیا سے ممانعت

روی[۱] انہ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: إنی کنت نھیتکم ان لا تنتبذوا فی الظروف: الدباء والمزفت والنقیر والحنتم۔ انتبذوا فیما

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

رأيتم ، واجتنبوا كل مسكر[2]۔

روایت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تمھیں دبا، مزفت، نقیر اور حنتم جیسے (شراب تیار کرنے والے) برتنوں میں نبیذ بنانے سے منع کیا تھا[1]۔ (لیکن اب اجازت دیتا ہوں کہ) تم جس برتن میں چاہو، نبیذ بنا سکتے ہو[2]۔ ہر نشہ آور چیز سے، البتہ پرہیز کرتے رہو۔

ترجمے کے حواشی

ا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دبا، حنتم، مزفت اور نقیر میں نبیذ تیار کرنے سے منع فرمایا تھا۔ یہ ان خاص برتنوں کے نام ہیں جن میں اہل عرب عام طور پر شراب تیار کرتے تھے۔ قرآن مجید اور بعض دوسری روایات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایسے برتنوں سے ممانعت اصل میں ان میں تیار ہونے والی شراب سے ممانعت تھی۔ اس موضوع کی تمام روایات پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے کسی خاص موقع پر سد ذریعہ کے اصول کے تحت یہ اسلوب اختیار فرمایا تھا اور اس کا مقصد شراب کے خبث کو نہایت درجہ واضح کرنا اور مسلمانوں کو اس کی ادنی آلایش سے بھی محفوظ رکھنا تھا۔

۲۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد ازاں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں پر شراب کی شناعت پوری طرح واضح ہوگئی ہے اور وہ یہ برتن میسر نہ ہونے کی وجہ سے بعض مسائل سے بھی دوچار ہیں تو آپ نے ان کے استعمال کی اجازت دے دی۔ نسائی، رقم ۵۶۵۶ اور بیہقی، رقم ۱۷۲۰۵، ۱۷۲۰۶ میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔ اسی ضمن کی ایک روایت یہ ہے:

روی انه بعث رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم الی القوم ۔ فدعاهم فقال : فی ای شیء تنتبذون ۔ قالوا : ننتبذ فی النقیر والدباء ولیس لنا ظروف ۔ فقال : لا تشربوا الا فیما اوکیتم علیه ۔ قال : فلبث بذلك ما شاء اللّٰه ان یلبث ثم رجع

''روایت کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قوم کے لوگوں کو بلوایا۔ جب وہ پہنچے تو آپ نے ان سے پوچھا: تم نبیذ بنانے کے لیے کون سے برتن استعمال کرتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: ہم نقیر اور دبا میں نبیذ تیار کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور برتن نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا: خمیر اٹھایا ہوا مشروب مت پیو، سوائے اس

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

علیهم فاذا هم قد اصابهم وباء واصفروا۔ قال : ما لی اراکم قد هلکتم؟ قالوا : یا نبی اللّٰه ، ارضنا وبیئة وحرمت علینا الا ما اوکینا علیه ۔ قال : اشربوا وکل مسکر حرام ۔ (نسائی، رقم ۵۶۵۵)

مشروب کے جسے تم نے برتن کا منہ بند کر کے تیار کیا ہو۔ کچھ عرصہ بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو دوبارہ دیکھا تو آپ نے انھیں کسی متعدی مرض میں مبتلا پایا۔ آپ نے ان سے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ مجھے تم کچھ بیمار لگ رہے ہو؟ لوگوں نے جواب دیا: اے اللہ کے نبی، ہماری سرزمین وبائی امراض کی آماج گاہ بنی ہوئی ہے، (پہلے ہم خمیر اٹھائے ہوئے مشروبات کو ان امراض سے بچاؤ کے لیے استعمال کر لیا کرتے تھے،) مگر آپ نے بند منہ والے برتن میں بنے ہوئے مشروب کے علاوہ ہر طرح کا مشروب حرام قرار دے دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم مشروب پیو، مگر یہ بات یاد رکھو کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بعض روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزفت کے استثنا کے ساتھ ان برتنوں کے عام استعمال کی اجازت دی۔ بخاری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

لما نهی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم عن الاسقیة قیل للنبی صلی اللّٰه علیه وسلم لیس کل الناس یجد سقاء فرخص لهم فی الجر غیر المزفت ۔ (رقم ۵۲۷۱)

''جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو (ان) برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا (جو عام طور پر شراب تیار کرنے کے لیے استعمال ہوتے تھے) تو لوگوں نے آپ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا کہ سب لوگوں کے پاس پینے کے (متبادل) برتن نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ نے مزفت کے علاوہ تمام برتنوں کے استعمال کی اجازت دے دی۔''

یہ روایت کچھ فرق کے ساتھ ان مقامات پر نقل ہوئی ہے:

مسلم، رقم ۲۰۰۰۔ نسائی، رقم ۵۶۵۰۔ ابوداؤد، رقم ۳۷۰۰۔ احمد ابن حنبل، رقم ۶۴۹۷۔ نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۵۱۶۰، ۶۸۴۱۔ بیہقی، رقم ۱۷۲۵۷، ۱۷۲۵۸۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۲۳۷۵۲،۱۱۸۱۳، ۲۳۷۸۰ اور مسند الحمیدی، رقم ۵۸۲۔

اس میں مزفت کے استثنا کے بارے میں دو باتیں قیاس کی جا سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ راویوں سے سہو ہوا ہے اور دوسرے یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ برتنوں کی حرمت ختم کرنے کے لیے تدریجی طریقہ اختیار کیا ہے۔ دوسری رائے اختیار کرنے

کی صورت میں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائی طور پر شراب تیار کرنے والے برتنوں کے ہر طرح کے استعمال پر پابندی عائد کر دی ہوگی۔ پھر آپ نے کچھ برتنوں کے عام استعمال پر پابندی اٹھا لی اور کچھ پر قائم رکھی۔ مزفت کا شمار بھی انھی برتنوں میں ہوتا ہوگا جن پر دوسرے مرحلے میں بھی پابندی عائد رہی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ شراب کی تیاری کے لیے مزفت کا استعمال سب سے بڑھ کر ہوگا۔

بالآخر آپ نے تمام برتنوں کے عام استعمال کی اجازت دے دی اور یہ بات واضح کر دی کہ ممانعت کا اصل تعلق کسی خاص ساخت کے برتن سے نہیں، بلکہ شراب سے ہے جو عام طور پر ان برتنوں میں تیار ہوتی تھی۔

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ نسائی کی روایت رقم ۲۰۳۳ ہے۔ کچھ فرق کے ساتھ یہ درج ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:
نسائی، رقم ۴۴۲۹، ۵۶۵۱، ۵۶۵۳۔ ابوداؤد، رقم ۳۷۰۰، ۳۷۰۱۔ احمد ابن حنبل، رقم ۱۲۳۵، ۴۳۱۹، ۶۹۷۹، ۱۳۵۱۲، ۱۳۶۴۰، ۲۳۰۵۳، ۲۳۰۵۵، ۲۳۰۶۵، ۲۳۰۶۶، ۲۳۰۶۷، ۲۳۰۸۸۔ ابن حبان، رقم ۳۱۶۸، ۵۴۰۰، ۵۴۰۹۔ نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۲۱۶۰، ۴۵۱۹، ۵۱۶۱، ۵۱۶۲۔ بیہقی، رقم ۶۹۸۸، ۶۹۸۹، ۱۷۱۸۷، ۱۷۲۶۱، ۱۷۲۶۵۔ دارقطنی، رقم ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۱۱۸۱۳، ۲۳۹۴۱۔ ابویعلیٰ، رقم ۳۷۰۵، ۵۲۹۹۔ عبدالرزاق، رقم ۱۱۸۱۳، ۲۳۷۵۲، ۲۳۷۸۰، ۲۳۷۸۱، ۲۳۷۸۲، ۲۳۷۸۳، ۲۳۷۸۴، ۲۳۷۸۵، ۲۳۷۸۶، ۲۳۷۸۷، ۲۳۷۸۸، ۲۳۷۸۹، ۲۳۷۹۰، ۲۳۷۹۲، ۲۳۷۹۴، ۲۳۷۹۵، ۲۳۷۹۸، ۲۳۸۰۲، ۲۳۸۰۴، ۲۳۸۰۶، ۲۳۸۷۰، ۲۳۸۷۱، ۲۳۹۴۲، ۲۳۹۴۳، ۲۳۹۴۴، ۲۳۹۴۵، ۲۳۹۴۶، ۲۳۹۴۷، ۲۳۹۴۸۔

۲۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۳۰۸۸ میں 'انتبذوا فیما رایتم واجتنبوا کل مسکر' (تم جس میں چاہو نبیذ بنا سکتے ہو۔ البتہ ہر نشہ آور چیز سے پرہیز کرتے رہو۔) کی جگہ 'وامرتکم بظروف وان الوعاء لا یحل شیاء ولا یحرمه فاجتنبوا کل مسکر' (میں نے تمھیں بعض برتن استعمال کرنے سے روکا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ کوئی برتن کسی چیز کو حلال یا حرام نہیں بناتا۔ چنانچہ اصل بات یہ ہے کہ ہر نشہ آور چیز سے اجتناب کرو) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہی بات ابوداؤد، رقم ۳۷۰۰ اور ۳۷۰۱ میں ان الفاظ میں آئی ہے: 'فقال اعرابی انه لا ظروف لنا فقال اشربوا ما حل واجتنبوا ما اسکر'۔ (ایک بدو نے کہا کہ ہمارے پاس کوئی اور برتن نہیں ہیں تو آپ نے فرمایا کہ جو حلال ہے، اسے پیو اور جو نشہ آور ہے، اس سے اجتناب کرو)۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

تکمیل ایمان

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۱۰۴۔۱۰۵)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عن علی رضی اللّٰہ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لا یؤمن عبد حتی یؤمن بأربع: یشہد أن لا إلہ إلا اللّٰہ وأنی رسول اللّٰہ بعثنی بالحق، ویؤمن بالموت، والبعث بعد الموت، ویؤمن بالقدر۔

''حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی بندہ (پوری طرح) ایمان نہیں لاتا جب تک وہ اس بات کا برملا اقرار نہ کرے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔ وہ موت اور موت کے بعد اٹھائے جانے پر ایمان لائے۔ اور وہ تقدیر پر ایمان لائے۔''

لغوی مباحث

لا یؤمن عبد حتی یؤمن بأربع: کوئی بندۂ مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ چار پر ایمان نہ لے آئے۔ اس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ایمان میں اصل اہمیت کس چیز کو حاصل ہے۔ ان میں سے کوئی جز بھی اگر رہ گیا تو ایمان درست نہیں رہا۔

یشھد: یہ اور اس کے بعد دو بار 'یؤمن' آیا ہے۔ یہ دونوں فعل 'یؤمن بأربع' کا بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔

بعثنی بالحق: اس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا۔ یعنی میں اس کا سچا پیغمبر ہوں۔ یہ جملے میں دوسری خبر واقع ہوا ہے۔

متون

یہ روایت تمام کتب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سند ہی سے نقل ہوئی ہے۔ اس روایت کے متون میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ چند لفظی اختلافات حسب ذیل ہیں: بعض روایات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ 'ثم' سے شروع ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات کسی طویل گفتگو کا حصہ تھی۔ ایک روایت میں 'لا یؤمن' کی جگہ 'لن یؤمن' آیا ہے۔ عام طور پر اس روایت کے متون میں 'عبد' کا لفظ نکرہ ہی استعمال ہوا ہے، لیکن ابن حبان کی ایک روایت میں لام تعریف کے ساتھ معرفہ آیا ہے۔ ایمانیات کا پہلا جز اس روایت کے متون میں چار مختلف اسالیب میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً کسی میں محض 'یؤمن باللّٰہ'، کسی میں 'حتی یشھد أن لا الہ الا اللّٰہ' یا 'یشھد أن لا إلٰہ إلا اللّٰہ' اور کسی میں 'باللّٰہ وحدہ لا شریك لہ' کے الفاظ سے یہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔ ایمان بالرسالت کا جز بھی دو اسالیب میں نقل ہوا ہے۔ کسی روایت میں 'أن اللّٰہ بعثنی بالحق' اور کسی روایت میں 'أنی محمد رسول اللّٰہ بعثنی بالحق' کے الفاظ آئے ہیں۔ زیر نظر روایت میں موت اور موت کے بعد اٹھائے جانے کا الگ الگ ذکر ہوا ہے۔ بعض روایات میں موت کا ذکر نہیں ہے۔ صرف بعث بعد الموت کا ذکر ہے۔ تقدیر پر ایمان کا ذکر بھی بعض روایات میں 'خیرہ و شرہ' کے اضافے کے ساتھ ہوا ہے اور بعض میں یہ اضافہ مذکور نہیں ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہے کہ اس روایت کے متون میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔

معنی

دین میں ایمان کو اصل اور جڑ کی حیثیت حاصل ہے۔ دین اسلام میں ایمانیات کے بنیادی اجزا تین ہیں۔ ایک 'لا إلٰہ إلا اللّٰہ' کا دل اور زبان سے اقرار، دوسرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت پر ایمان اور تیسرے موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر یقین۔ اس روایت میں اس پر تقدیر کا اضافہ بیان ہوا ہے اور اس مضمون کی حامل دوسری روایات میں فرشتوں اور کتابوں پر ایمان کو بھی ایمانیات کے حصے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ واضح ہے کہ تقدیر پر ایمان، ایمان باللہ کا جز ہے اور فرشتوں اور کتابوں پر ایمان کا تعلق بنیادی طور پر نبوت و رسالت پر ایمان سے ہے۔ اسی طرح کی کچھ اور جزئی چیزیں بھی اس فہرست میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم موقع کلام کی رعایت سے کبھی کچھ اجزا کا ذکر کرتے اور کبھی

کچھ دوسرے اجزا کا ذکر کرتے ہیں۔ اس نوع کی روایات میں تقدیر کا ذکر بار بار ہوا ہے۔ ایمان باللہ کی نسبت سے یہ ایک اہم معاملہ ہے۔ انسانوں کو کائنات کے محکم اور علت و معلول پر مبنی نظام کو دیکھ کر یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ وجود میں آیا ہے یا یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ ہی نے اسے تخلیق کیا ہے تو اب وہ اس میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار یہ بات اس لیے فرمائی ہے کہ اہل اسلام اس نوع کی کسی غلطی کا شکار نہ ہوں۔

اس روایت میں موت کا ذکر الگ سے بھی ہوا ہے۔ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ کیا موت کے ساتھ انسان ہمیشہ کے لیے مٹ جاتا ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور معاملہ شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں موت کا لفظ محض تمہیداً آیا ہے۔ اصل بات وہی ہے جو آگے بیان ہوئی ہے۔

کتابیات

ترمذی، رقم ۲۰۷۱۔ ابن ماجہ، رقم ۷۸۔ مسند احمد، رقم ۷۱۹، ۱۰۵۷۔ ابن حبان، رقم ۱۷۸۔ المستدرک علی الصحیحین، رقم ۹۰۔ الأحادیث المختارہ، رقم ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۳۔ موارد الظمآن، رقم ۲۳۔ مسند البزار، رقم ۹۰۴۔ مسند الطیالسی، رقم ۱۰۶۔ مسند ابو یعلیٰ ۳۵۲، ۵۸۳۔ مسند عبد بن حمید، رقم ۷۵۔

مرجئہ اور قدریہ کا انجام

عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: صنفان من أمتی لیس لهما فی الإسلام نصیب: المرجئة والقدریة۔

’’حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے دو گروہ ہیں جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں: ایک مرجئہ اور دوسرے قدریہ۔‘‘

لغوی مباحث

المرجئة :اہل اسلام میں نمایاں ہونے والا وہ گروہ جو جبر کا قائل تھا۔ان کے نزدیک بندوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ایمان کو معصیت کوئی نقصان نہیں پہنچاتی جس طرح کفر کو اطاعت کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ان کے نزدیک انسانوں سے اعمال کی نسبت اسی نوع کی ہے جس نوع کی نسبت اعمال کی جمادات سے ہے۔'مرجئة' اسم فاعل ہے اوراس کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ' أرجأ' سے بنایا گیا ہے اور یہ بھی کہ یہ 'ارجی' سے ماخوذ ہے۔دونوں فعل کام کو موخر کرنے کے معنی میں آتے ہیں۔

القدرية : یہ لوگ تقدیر کے منکر تھے۔یعنی جو کچھ دنیا میں ظاہر ہو رہا ہے، وہ نیا ہوتا ہے۔پہلے سے مقرر کردہ نہیں ہے۔انسان اپنی قدرت اور صلاحیت سے امور سرانجام دیتے ہیں۔انسان کے اعمال کا کوئی تعلق اللہ تعالیٰ کے ارادہ و اختیار سے نہیں ہوتا۔ یہ لوگ چونکہ تقدیر کو زیر بحث لاتے رہتے تھے، اس لیے ان کا نام قدریہ پڑ گیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

متون

اس روایت کے متون میں بھی کوئی اہم فرق روایت نہیں ہوا۔کچھ لفظی فرق حسب ذیل ہیں۔کچھ روایات میں'من أمتی' کی جگہ'من هذه الأمة 'روایت ہوا ہے۔مرجئہ اور قدریہ کا انجام بیان کرنے کے لیے کچھ روایات میں'ليس لهما في الإسلام نصيب 'کے بجائے'لا تنالهما شفاعتي 'اور کچھ روایات میں'لا يردان على الحوض و لا يدخلان الجنة 'کے الفاظ آئے ہیں۔زیر مطالعہ روایت کے آخر میں ان گروہوں کے نام ایک ایک لفظ'المرجئة'اور 'القدرية' کی صورت میں آئے ہیں۔ایک روایت میں اس کے بجائے 'أهل الإرجاء'اور'أهل القدر' کی ترکیب اختیار کی گئی ہے۔اس روایت کے متون میں ایک متن کافی مفصل ہے۔ہم اسے یہاں مکمل نقل کر رہے ہیں:

صنفان من أمتي، لا تنالهم شفاعتي يوم القيامة، لعنهم الله على لسان سبعين نبيا قبلي۔ قيل: فمن هم، يا رسول الله؟ قال: القدرية و المرجئة۔ قيل: فمن المرجئة؟ قال: الذين يقولون الايمان قول بلا عمل۔ والقدرية الذين يعملون

''میری امت کے دو گروہ ہیں، قیامت کے دن انھیں میری شفاعت نہیں پہنچے گی۔اللہ تعالیٰ نے ان پر مجھ سے پہلے کے ستر نبیوں کی زبان سے لعنت کی ہے۔پوچھا گیا: یہ کون ہیں، یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا: یہ قدریہ اور مرجئہ ہیں۔پوچھا گیا: یہ مرجئہ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: جو یہ کہتے ہیں: ایمان عمل کے بغیر صرف قول ہے۔اور

بـالـمـعاصی و یقولون هی من اللّٰه إجبار أما و لو شاء اللّٰه ما أشر کنا و ما عصینا۔
(مسند الربیع، رقم ۸۰۶)

قدریہ وہ ہیں جو گناہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبر ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہم گناہ کرتے۔‘‘

معنی

اس روایت کے بارے میں سب سے پہلا سوال اس کی حیثیت کے بارے میں ہے۔ یہ روایت اپنے الفاظ ہی سے واضح ہے کہ ایک موضوع روایت ہے۔ اس روایت میں جس طرح بعد میں پیدا ہونے والے کلامی گروہوں کا نام لیا گیا ہے، وہ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی صحیح روایات میں بعد کے زمانوں میں پیدا ہونے والے بہت سے فتنوں کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن ان میں اس طرح نامزد کرنے کا اسلوب کہیں بھی اختیار نہیں کیا گیا۔ یہ روایات یقیناً ان گروہوں کے پیدا ہونے کے بعد ان کے ابطال کے لیے وضع کی گئی ہیں۔ متن پر مبنی اس تجزیے کی تائید البانی مرحوم کے اس روایت پر تبصرے سے بھی ہوتی ہے۔ جو فن رجال میں ہمارے دور میں ایک بڑے آدمی ہیں۔ یہ تبصرہ انھوں نے مشکوٰۃ کے حاشیے پر کیا ہے:

......ولـکنها ثابتة فی سنن ترمذی ۰ وهو عـنـده من طریقین ضعیفین: عن عکرمة، عـن ابن عباس ۔ و قـد رویـت له شواهد، ولـکنها واهیه کلها ۔حتی عده بعضهم من الموضوعات ۔ قـال العلائی: والحق أنه ضعیف لا موضوع ۔

’’......مگر یہ سنن ترمذی میں ثابت ہے۔ ان کی رائے میں یہ دو ضعیف سندوں سے ملتی ہے: ایک عکرمہ سے اور ایک ابن عباس سے۔ اس کے شواہد بھی روایت کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ سب کے سب واہی ہیں۔ حتیٰ کہ انھیں بعض نے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ علائی کے نزدیک: درست بات یہ ہے کہ یہ ضعیف ہے، موضوع نہیں ہے۔‘‘

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اپنی اس حیثیت میں یہ روایت یہ حق نہیں رکھتی کہ اس کی شرح کی جائے۔ لیکن قارئین کی اطلاع کے لیے صرف ان بحثوں کا ایک خلاصہ بیان کرنا کافی ہوگا جو شارحین نے اس روایت کے تحت کی ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ ’لیـس لهـما فی الاسـلام نصیب‘ سے کیا مراد ہے۔ متون کی بحث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ جملے اس سے بھی سخت روایت کیے گئے ہیں۔ لیکن بالعموم شارحین کا خیال یہ ہے کہ یہ ان کے کفر پر دلالت کے لیے نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ان گروہوں کی غلطی اجتہادی ہے۔ بس اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ لوگ اسلام کے خیر کے بڑے حصے سے محروم ہیں۔ دوسرا سوال اس روایت کے ضمن میں یہ زیر بحث آیا ہے کہ آیا گمراہ فرقوں کی تکفیر جائز ہے یا نہیں؟ اس کے بعد وہ علما کے طرز عمل سے استدلال کرتے

ہوئے اسی رائے کو ظاہر کرتے ہیں کہ تکفیر نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ کسی زمانے میں بھی علما نے ان گروہوں کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلق کو منقطع نہیں کیا۔

یہ نکات محض معلومات کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔ ورنہ کوئی واہی روایت کسی استدلال کے لیے ہرگز موزوں نہیں۔

کتابیات

ترمذی، رقم ۲۰۷۵۔ ابن ماجہ، رقم ۲۰۷،۶۱۔ مجمع الزوائد، ۲۰۶/۷۔ مسند الربیع، رقم ۸۰۶۔ المعجم الاوسط، رقم ۵۸۱۷۔ مسند عبد بن حمید، رقم ۵۷۹۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

قانون معاشرت

(۱۴)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

والدین

وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ، حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰى وَهۡنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِىۡ عَامَيۡنِ، اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ وَلِوَالِدَيۡكَ، اِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ. وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَصَاحِبۡهُمَا فِى الدُّنۡيَا مَعۡرُوۡفًا، وَّاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَىَّ، ثُمَّ اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ، فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ. (لقمٰن ۳۱: ۱۴-۱۵)

’’اور ہم نے انسان کو اُس کے والدین کے بارے میں نصیحت کی ہے ـــــ اُس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اُس کو پیٹ میں رکھا اور اُس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہوا ـــــ (ہم نے اُس کو نصیحت کی ہے) کہ میرے شکر گزار رہو اور اپنے والدین کا شکر بجالاؤ۔ بالآخر پلٹنا میری ہی طرف ہے۔ لیکن اگر وہ تم پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھیراؤ جسے تم نہیں جانتے تو اُن کی بات نہ مانو اور دنیا میں اُن کے ساتھ نیک برتاؤ کرتے رہو اور پیروی اُنھی لوگوں کے طریقے کی کرو جو میری طرف متوجہ ہیں۔ تم سب کو پلٹنا پھر میری ہی طرف ہے اور میں (اُس وقت) تمھیں بتادوں گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔‘‘

والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم تمام الہامی صحائف میں دی گئی ہے۔ قرآن مجید نے بھی جگہ جگہ اس کی تلقین فرمائی ہے۔ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیات ۲۳-۲۴، عنکبوت (۲۹) کی آیت ۸ اور احقاف (۴۶) کی آیت ۱۵ میں یہ مضمون کم و بیش انھی الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ سورۂ لقمان کی ان آیات میں، البتہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ والدین سے حسن سلوک کے حدود بھی بالکل متعین فرما دیے ہیں۔ اس سے حکم کی جو صورت سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے:

۱۔انسان کے والدین ہی اس کے وجود میں آنے اور پرورش پانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔اس میں شبہ نہیں کہ اس معاملے میں باپ کی شفقت بھی کچھ کم نہیں ہوتی، لیکن حمل، ولادت اور رضاعت کے مختلف مراحل میں جو مشقت بچے کی ماں اٹھاتی ہے، اس کا حق کوئی شخص کسی طرح ادا نہیں کر سکتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی بنا پر ماں کا حق باپ کے مقابل میں تین درجے زیادہ قرار دیا ہے۔[۵۸] لہٰذا اللہ تعالیٰ کی نصیحت ہے کہ اپنے پروردگار کے بعد انسان کو سب سے بڑھ کر اپنے ماں باپ ہی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ شکر محض زبان سے ادا نہیں ہوتا۔اس کا لازمی تقاضا ہے کہ آدمی ان کے ساتھ انتہائی احترام کے ساتھ پیش آئے، ان کے خلاف دل میں کوئی بیزاری نہ پیدا ہونے دے، ان کے سامنے سوءِ ادب کا کوئی کلمہ زبان سے نہ نکالے، بلکہ نرمی، محبت، شرافت اور سعادت مندی کا اسلوب اختیار کرے۔ان کی بات مانے اور بڑھاپے کی ناتوانیوں میں ان کی دل داری اور تسلی کرتا رہے۔

بنی اسرائیل میں فرمایا ہے:

وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا، اِمَّا يَبۡلُغَنَّ عِنۡدَكَ الۡكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوۡ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلۡ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنۡهَرۡهُمَا، وَقُلۡ لَّهُمَا قَوۡلًا كَرِيۡمًا، وَ اخۡفِضۡ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَةِ وَقُلۡ رَّبِّ ارۡحَمۡهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيۡ صَغِيۡرًا۔ رَبُّكُمۡ اَعۡلَمُ بِمَا فِيۡ نُفُوۡسِكُمۡ، اِنۡ تَكُوۡنُوۡا صٰلِحِيۡنَ، فَاِنَّهٗ كَانَ لِلۡاَوَّابِيۡنَ غَفُوۡرًا۔ (۱۷: ۲۳۔۲۴)

’’اور تیرے پروردگار کا فیصلہ یہ ہے کہ اُس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو۔ تمھارے سامنے اگر اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انھیں اف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ادب کی بات کہو اور اُن کے سامنے مہر و محبت سے عاجزی کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ پروردگار، ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے بچپن میں مجھے پالا تھا۔تمھارا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے۔ اگر تم سعادت مند رہو گے تو رجوع کرنے والوں کے لیے وہ بڑا بخشنے والا ہے۔‘‘

سیدنا ابن مسعود کی روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اللہ تعالیٰ کو کون سا عمل سب سے زیادہ پسند ہے؟ آپ نے فرمایا: وقت پر نماز پڑھنا۔ میں نے پوچھا: اس کے بعد؟ فرمایا: والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ۔[۵۹]

ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس شخص کے لیے ذلت ہے، اس شخص کے لیے ذلت ہے، اس شخص کے لیے ذلت ہے۔ لوگوں نے پوچھا: کس کے لیے، یا رسول اللہ؟ فرمایا: جس کے ماں باپ یا ان میں سے کوئی ایک

۵۸؎ بخاری، رقم ۵۹۷۱۔

۵۹؎ بخاری، رقم ۵۹۷۰۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس کے پاس بڑھاپے کو پہنچا اور وہ اس کے باوجود جنت میں داخل نہ ہو سکا۔[٦٠]

عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے جہاد کی اجازت چاہی۔ آپ نے پوچھا: تمھارے والدین زندہ ہیں؟ عرض کیا: جی ہاں۔ فرمایا: پھر ان کی خدمت میں رہو، یہی جہاد ہے۔[٦١]

ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ یمن کے لوگوں میں سے ایک شخص جہاد کی غرض سے ہجرت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے پوچھا: یمن میں کوئی عزیز ہے؟ عرض کیا: میرے ماں باپ ہیں۔ فرمایا: انھوں نے اجازت دی ہے؟ عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: جاؤ اور ان سے اجازت لو۔ اگر دیں تو جہاد کرو، ورنہ ان کی خدمت کرتے رہو۔[٦٢]

معاویہ اپنے باپ جاہمہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ، جہاد کے لیے جانا چاہتا ہوں اور آپ سے مشورے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے پوچھا: تمھاری ماں زندہ ہے؟ عرض کیا: جی ہاں۔ فرمایا: تو اس کی خدمت میں رہو، اس لیے کہ جنت اس کے پاؤں کے نیچے ہے۔[٦٣]

سیدنا عبداللہ بن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پروردگار کی خوشی باپ کی خوشی میں اور اس کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے۔[٦٤]

ابوالدردا کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جنت کا بہترین دروازہ باپ ہے، اس لیے چاہو تو اسے ضائع کرو اور چاہو تو اس کی حفاظت کرو۔[٦٥]

عمرو بن شعیب اپنی ماں سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتی ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا: میرے پاس کچھ مال ہے اور میری اولاد بھی ہے، لیکن میرے والد اس مال کے ضرورت مند ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم اور تمھارا مال، دونوں والد ہی کے ہیں۔[٦٦]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۲۔ والدین کی اس حیثیت کے باوجود یہ حق ان کو حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کو بے دلیل اللہ تعالیٰ کا شریک بنانے کے لیے اولاد پر دباؤ ڈالیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ والدین کی نافرمانی شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے،[٦٧] لیکن

٦٠؎ مسلم، رقم ٦٢٧٤۔

٦١؎ بخاری، رقم ٥٩٧٢۔

٦٢؎ ابوداؤد، رقم ٢٥٣٠۔

٦٣؎ نسائی، رقم ٣١٠٤۔

٦٤؎ ترمذی، رقم ١٨٩٩۔

٦٥؎ ترمذی، رقم ١٩٠٠۔

٦٦؎ ابوداؤد، رقم ٣٥٣٠۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں حکم دیا ہے کہ اس معاملے میں اولاد کو ان کی اطاعت سے صاف انکار کر دینا چاہیے اور پیروی ہر حال میں انھی لوگوں کے طریقے کی کرنی چاہیے جو خدا کی طرف متوجہ ہیں۔ خدا سے انحراف کی دعوت والدین بھی دیں تو قبول نہیں کی جا سکتی۔ 'لاطاعة فی المعصية، انما الطاعة فی المعروف'[68]، (اللہ کی نافرمانی میں کسی کی کوئی اطاعت نہیں ہے، اطاعت تو صرف بھلائی کے کاموں میں ہے)، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اسی بنا پر فرمائی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکام و ہدایات بھی اسی کے تحت سمجھے جائیں گے اور والدین کے کہنے سے ان کی خلاف ورزی بھی کسی کے لیے جائز نہ ہوگی۔

۳۔ شرک جیسے گناہ پر اصرار کے باوجود دنیا کے معاملات میں والدین کے ساتھ حسن سلوک دستور کے مطابق اسی طرح باقی رہنا چاہیے۔ ان کی ضروریات حتی المقدور پوری کرنے کی کوشش کی جائے اور ان کے لیے ہدایت کی دعا بھی برابر جاری رہے۔ یہ سب 'صاحبهما فی الدنيا معروفاً' کا تقاضا ہے۔ دین و شریعت کا معاملہ الگ ہے، مگر اس طرح کی چیزوں میں اولاد سے ہرگز کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

آخر میں اولاد اور والدین، دونوں کو اللہ تعالیٰ نے توجہ دلائی ہے کہ اعمال کی جواب دہی کے لیے ایک دن پلٹنا میری ہی طرف ہے، 'ثم الی مرجعكم فانبئكم بما كنتم تعملون'۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''یہ خطاب والدین اور اولاد، دونوں سے یکساں ہے اور اس میں تنبیہ بھی ہے اور اطمینان دہانی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ایک دن سب کی واپسی میری ہی طرف ہونی ہے اور اس دن جو کچھ جس نے کیا ہوگا، میں اس کے سامنے رکھ دوں گا۔ اگر کسی کے والدین نے میرے بخشے ہوئے حق سے غلط فائدہ اٹھا کر اولاد کو مجھ سے منحرف کرنے کی کوشش کی تو وہ اس کی سزا بھگتیں گے اور اولاد نے والدین کے حق کے ساتھ ساتھ میرے حق کو بھی کما حقہ پہچانا اور اس حق پر قائم رہنے میں استقامت دکھائی تو وہ اپنی اس عزیمت کا بھرپور صلہ پائے گی۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۱۳۰)

(باقی)

۶۷۔ بخاری، رقم ۵۹۷۶۔

۶۸۔ بخاری، رقم ۷۲۵۷۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

محمد اسلم نجمی

سیرت النبی

[علامہ ابن کثیر کی کتاب ''سیرت النبی'' سے ماخوذ]

(۱)

واقعات عرب کا بیان

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بیان کیا جاتا ہے کہ تمام عرب[1] قبائل حضرت اسمٰعیل[2] علیہ السلام سے اپنی نسبت قائم کرتے اور انھیں اپنا جد امجد اور مورث اعلیٰ مانتے ہیں۔

صحیح اور مشہور قول یہ ہے کہ عرب دو حصوں میں منقسم ہیں۔ ان میں سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے قبل کے عرب باشندے عرب عاربہ کہلاتے ہیں۔ عاد، ثمود، طسم، امیم، جرھم اور عمالیق اور اسی طرح کی بعض دوسری اقوام انھی کی قبیل سے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمد سے بھی پہلے عرب میں آباد تھے اور ان کی نسل میں سے لوگوں کی کچھ تعداد ان کے زمانے میں بھی موجود تھی۔

ان کی دوسری قسم عرب مستعربہ کہلاتی ہے۔ اس نسل کے لوگ عرب کے علاقے حجاز کے باشندے ہیں اور ان کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے ہے۔

یمن میں آباد عرب حمیر کہلاتے ہیں۔ ابن ماکول کی روایت کے مطابق وہ قحطان نام کے ایک شخص کی اولاد میں سے ہیں جس کا اصل نام مہزم تھا۔ مورخین کے بیان کے مطابق وہ چار بھائی تھے۔ قحطان کے علاوہ باقی بھائیوں کے نام قاحط، مقحط اور فالغ ہیں۔

قحطان کون تھا؟ اس کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض روایات کے مطابق:

۱۔ قحطان حضرت ہود علیہ السلام کا بیٹا تھا۔

۲۔قحطان ہود علیہ السلام ہی کا دوسرا نام ہے۔

۳۔قحطان ہود علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا۔

۴۔قحطان حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے تھا۔

بعض علماے انساب نے ان کا سلسلۂ نسب یہ بیان کیا ہے:

قحطان بن ہمیسع بن تیمن بن قیذر بن نبت بن اسمٰعیل علیہ السلام۔

ان کے سلسلۂ نسب کے بارے میں اور اقوال بھی ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں 'باب نسبة الیمن الی اسمٰعیل علیه السلام' کے تحت حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ اسلم کے لوگوں کے پاس سے گزرے تو آپ نے دیکھا کہ وہ شمشیر زنی کی مشق کر رہے ہیں۔اس پر آپ نے فرمایا: اے بنی اسمٰعیل! تیر اندازی کرو اور اس معاملے میں میں فریقین میں سے فلاں فریق کے ساتھ ہوں۔اس پر انھوں نے اپنے ہاتھ روک لیے۔آپ نے پوچھا: تمھیں کیا ہوا؟ تم تیر اندازی سے کیوں رک گئے؟ انھوں نے کہا: ہم تیر اندازی کی یہ مشق کیسے جاری رکھ سکتے ہیں جبکہ آپ فلاں یعنی مدمقابل فریق کے ساتھ شامل ہیں۔ایسی صورت میں آپ کو گزند پہنچنے کا خطرہ ہے۔یہ سن کر آپ نے کسی ایک فریق کے ساتھ مل کر تیر اندازی کی مشق میں حصہ لینے کا ارادہ ترک کر دیا اور فرمایا: تیر اندازی کی مشق جاری رکھو، میں تم سب کے ساتھ ہوں۔

امام بخاری اس روایت کے بیان کرنے میں منفرد ہیں۔

ایک دوسری روایت میں انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر قبیلہ اسلم کے ایسے لوگوں کے قریب سے ہوا جو تیر اندازی کے طریق پر شمشیر زنی کر رہے تھے۔یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا: تیر اندازی کرو اے بنی اسمٰعیل، میں بھی تم دونوں فریقوں میں سے بنی فلاں شامل ہو جاتا ہوں۔یہ سن کر وہ رک گئے۔اس پر آپ نے پوچھا: تمھیں کیا ہوا؟ تم نے نشانہ بازی روک دی؟ انھوں نے عرض کی: ہم کیسے تیر اندازی کر سکتے ہیں جب کہ آپ بنی فلاں کے ساتھ شامل ہیں اور ایسی صورت میں آپ کو گزند پہنچ سکتا ہے۔اس پر آپ نے فرمایا: تم تیر اندازی کرو، میں کسی ایک گروہ کے ساتھ شامل ہونے کے بجائے تم سب کے ساتھ ہوں۔

امام بخاری یہ روایت بیان کرنے میں بھی منفرد ہیں۔

بعض روایات میں ان سے یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں کہ بنی اسمٰعیل شمشیر زنی کے بجائے تیر اندازی کرو، کیونکہ تمھارے جد امجد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بہت بڑے تیر انداز تھے، تم تیر اندازی ہی کرو اور میں ابن الادرع کی طرف سے تمھارے ساتھ شریک ہوتا ہوں۔اس گروہ نے تیر اندازی سے ہاتھ کھینچ لیا، مبادا آپ کو کوئی گزند پہنچے۔تب آپ نے فرمایا: تم تیر

اندازی جاری رکھو، میں تم سب کے ساتھ ہوں یعنی میں کسی ایک گروہ کی طرف سے شامل ہو کر فریق نہیں بنتا۔

امام بخاری فرماتے ہیں: اسلم بن افصی بن حارثہ بن عمر بن عامر بنو خزاعہ میں سے تھا۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ بنو خزاعہ[۳] سبا[۴] کے قبائل کی ایک شاخ ہے۔ یہ ان سے اس وقت جدا ہو گئے جب اللہ تعالیٰ نے ان پر عرم[۵] کا سیلاب بھیجا۔ اوس اور خزرج[۶] بھی انھی قبائل سبا کی شاخیں ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی مخاطب کر کے فرمایا تھا: تیر اندازی کرو، اے بنی اسمٰعیل۔ آپ کا یہ فرمانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اوس وخزرج بھی بنی اسمٰعیل کی اولاد میں سے تھے۔

بعض لوگوں نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ انھیں بنی اسمٰعیل میں سے قرار دینے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ وہ جنس عرب سے ہیں، مگر امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ تاویل بعید، ظاہر کلام کے خلاف اور بلا دلیل بات ہے۔

ان تمام آرا کے علی الرغم جمہور کا فیصلہ یہی ہے کہ قحطانی عرب یمن اور دوسرے علاقوں کے رہنے والے ہیں۔ یہ اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں ہیں۔ اور ان کے نزدیک تمام عرب قحطانی اور عدنانی، دو ہی قبائل میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتے ہیں۔ قحطانی عرب دو شاخوں سبا اور حضرموت میں منقسم ہو گئے ہیں۔ اسی طرح عدنانیوں کی بھی دو شاخیں ربیعہ اور مضر ہیں۔ یہ دونوں گروہ نزار بن معد بن عدنان کی اولاد میں سے ہیں۔

عربوں کے پانچویں قبیلے کا نام قضاعہ ہے۔ اس کے بارے میں مورخین کا اختلاف ہے۔ ابن عبدالبر اور اکثر مورخین کی رائے میں یہ دراصل عدنانی ہی ہیں۔ ابن عباس، ابن عمر اور جبیر بن مطعم سے بھی یہی قول نقل ہوا ہے۔ زبیر بن بکار اور ان کے چچا مصعب زبیری اور ابن ہشام بھی اسی نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔ اس نسبت کے بارے میں ایک حدیث بھی ملتی ہے، مگر ابن عبدالبر اور بعض دوسرے اہل علم کی رائے میں وہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

بعض اہل تحقیق کی رائے ہے کہ یہ لوگ دور جاہلیت اور اسلام کی ابتدا میں اپنی نسبت عدنان کی طرف کرتے تھے، البتہ یہ لوگ خالد بن یزید بن معاویہ کے ننھیالی رشتہ دار تھے۔ لہٰذا جب ان کا دور آیا تو یہ قحطانی کہلانے لگے۔ عرب کا مشہور شاعر اعشیٰ بن ثعلبہ اپنے ایک قصیدے میں ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''بنو قضاعہ کو یہ بات لکھ کر پہنچا دو کہ وہ اگر اللہ والوں کی اولاد نہ ہوتے (یعنی ان کا تعلق بنو عدنان سے نہ ہوتا) تو وہ کبھی صاحب عزت قرار نہ پاتے۔''

> ''قضاعہ کا دعویٰ ہے کہ وہ اہل یمن میں سے ہیں اور قحطانی ہیں، مگر اللہ جانتا ہے کہ نہ انھوں نے خیر کی بات کہی اور نہ انھوں نے سچ بولا۔''

> ''انھوں نے ایک ایسے شخص کو اپنا والد قرار دیا ہے جو کبھی ان کی ماں سے نہیں ملا۔ وہ یہ بات بہت اچھی طرح جانتے ہیں، مگر (ان میں اور ہم میں) فرق یہی ہے کہ ہم حقیقت کا اقرار کرتے ہیں، وہ جانتے بوجھتے نہیں مانتے۔''

ابو عمرو السہیلی نے اپنی کتاب ''روض الانف'' میں عربوں کے کچھ اشعار پیش کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو قضاعہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کی اہل یمن کی طرف نسبت یعنی ان کے قحطانی ہونے کا دعویٰ ان کی اپنی ایجاد و اختراع ہے۔

اس نقطۂ نظر کے علی الرغم ابن اسحٰق، کلبی اور بعض دوسرے علمائے انساب کی رائے ہے کہ بنو قضاعہ قحطانی ہی ہیں۔ ابن اسحٰق نے ان کا سلسلہ نسب یوں بیان کیا ہے:

قضاعہ بن مالک بن حمیر بن سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان۔

ان کے بعض شعرا نے بھی اپنے اشعار میں قحطانیہ کی جانب اپنی نسبت کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک عمرو بن مرہ جو کہ صحابی بھی ہیں اور اس بارے میں ان سے دو حدیثیں بھی مروی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''اے پکارنے والے تو ہمیں پکار اور خوش ہو اور بنو قضاعہ کی طرف ہمیں بلا تکلف منسوب کر اور تو ہمیں حقیر نہ سمجھ ہم گورے چٹے شیخ قضاعہ بن مالک بن حمیر کی اولاد ہیں۔''

''ہمارا یہ نسب نہایت معروف ہے، اس کا انکار ممکن نہیں ہے۔ یہ تو گویا ایسی حقیقت ہے جو پتھر پر نقش ہے اور یہ پتھر مسجد کے ممبر کے نیچے محفوظ ہے۔''

بعض علمائے انساب کے مطابق قضاعہ کا شجرۂ نسب یہ ہے:

قضاعہ بن مالک بن عمرو بن مرۃ بن زید بن حمیر۔

ابن لہیعہ عقبہ بن عامر سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا ہم بنو معد میں سے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: نہیں۔ عقبہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: تو پھر ہمارا شجرۂ نسب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: تم قضاعہ بن مالک بن حمیر کی اولاد ہو۔

ابو عمر بن عبد البر کہتے ہیں کہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جہینہ بن زید بن اسلم بن عمران بن الحاف بن قضاعہ ہی عقبہ بن عامر الجہنی کا قبیلہ تھا۔ اگر اسے درست مان لیا جائے تو قضاعہ اہل یمن اور حمیر بن سبا کی اولاد قرار پاتے ہیں۔

ابن زبیر بن بکار اور بعض دوسرے علمائے انساب نے بنو قضاعۃ کے عدنانی یا قحطانی ہونے کے بارے میں دونوں اقوال میں یوں تطبیق دی ہے کہ مالک بن حمیر نے قبیلہ جرہم کی ایک عورت سے شادی کی۔ اس کے شکم سے قضاعہ پیدا ہوا۔ پھر قضاعہ کا والد فوت ہو گیا اور اس کی والدہ معد بن عدنان کی زوجیت میں آ گئی۔ بعضوں کا خیال ہے کہ جب وہ معد کے گھر میں آئی تو وہ حاملہ تھی، اس لیے اس دور کے رواج کے مطابق وہ، پیدایش کے بعد اپنی ماں کے شوہر کی طرف منسوب ہو گیا۔

محمد بن سلام بصری کی تحقیق کے مطابق عرب تین قبائل، قحطانی، عدنانی اور بنو قضاعہ پر مشتمل ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ قحطانیوں اور عدنانیوں میں سے کس کی اکثریت ہے؟ اس نے کہا کہ اس کا انحصار بنو قضاعہ کے الحاق پر ہے۔ انھیں اگر یمنی عربوں میں شمار کیا جائے تو قحطانیوں کی اکثریت ہو گی اور اگر ان کا سلسلۂ نسب بنو معد سے قائم کیا جائے تو عدنانی زیادہ ہوں گے۔

اس بحث سے واضح ہے کہ علمائے انساب کا بنو قضاعہ کی نسبت میں اختلاف ہے۔ اور اگر ابن لہیعۃ کی مذکورہ روایت کو صحیح

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مان لیا جائے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قحطانی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی نر اور ناری سے پیدا کیا ہے اور تم کو کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے کہ تم باہم دگر تعارف حاصل کرو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ اشرف وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔''
(الحجرات ۴۹: ۱۳)

اللہ تعالیٰ نے شعوب وقبائل کا اس طرح ذکر نسلی، خاندانی اور گروہی غرور کے خاتمے کے لیے کیا ہے، مگر علماے انساب نے اسے انسانوں کی عمومی تقسیم خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ آیت مذکور میں شعوب کا لفظ استعمال ہوا ہے، مگر اس کے مفہوم میں اور معانی بھی شامل ہیں، اور وہ اس طرح کہ نسب کا انتہائی بالائی حصہ شعب کہلاتا ہے، لہٰذا پہلے شعوب کا ذکر ہوتا ہے، پھر قبائل پھر عمائر پھر بطون پھر افخاذ پھر فصائل اور پھر عشائر آتے ہیں۔ اور عشائر عشیرہ کی جمع ہے یہ لفظ عربی میں رشتہ دار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد کسی شخص کے سب سے قریبی اعزا ہوتے ہیں۔ ان کے بعد شعوب کی قبیل سے کوئی رشتہ باقی نہیں بچتا۔

اب اس تفصیل کے بعد خدا کی تائید ونصرت سے پہلے ہم قحطانیہ کے ذکر سے اپنی بحث کی ابتدا کریں گے اور پھر حجازی عربوں، جو کہ عدنانی ہیں، اور دور جاہلیت کے واقعات کا ذکر کریں گے تا کہ یہ سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تمہید بن جائیں۔ کیونکہ ثقاۃ جامعین سیرت نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

امام بخاری اپنی صحیح میں 'باب ذکر قحطان' کے تحت حضرت ابو ہریرہ کی ایک روایت لائے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت برپا نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ قحطان میں سے ایک شخص اٹھے گا اور وہ لوگوں کو اپنے عصا سے ہانکے گا (یعنی وہ بادشاہ بنے گا)۔ یہی روایت مسلم میں ثور بن زید سے روایت ہوئی ہے۔

سہیلی کی تحقیق کے مطابق قحطان وہ پہلا شخص تھا جسے 'ابیت اللعن' کا خطاب دیا گیا، اور وہ پہلا شخص تھا جسے 'انعم صباحاً' کہا گیا۔

امام احمد ذی فجر کے حوالے سے ایک روایت بیان کرتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حکمرانی پہلے حمیر کے پاس تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ اعزاز چھین کر قریش کو دے دیا۔ امام احمد بن حنبل کے بیٹے عبداللہ کہتے ہیں کہ میرے والد کی کتاب میں و س ی ع و د ا ل ی ہ م کی صورت میں مقطعات موجود تھے اور انھیں ہم اگر رواں صورت میں پڑھیں تو یہ 'وسیعود الیہم' بنتا ہے۔ گویا یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ سیادت وبادشاہت قریش سے دوبارہ حمیر کو منتقل ہو جائے گی۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حواشی

۱؎ یہ قبائل عرب کے جس خطے میں آباد ہوئے وہ جزیرہ نما ہے۔ یہ تین اطراف سے پانی میں گھرا ہوا ہے۔ اس کے مشرق میں خلیج فارس ہے۔ قدما اسے بحر جنوبی، بحر اسفل، بحر تحتانی اور بحر شروق وغیرہ جیسے ناموں سے جانتے تھے۔ اسی طرح اس کے جنوب میں بحر ہند اور مغرب میں بحر احمر ہے۔ یونانی، لاطینی اور جدید خریطوں میں بحر احمر کا نام خلیج عربی بیان ہوا ہے، جبکہ عربی کتب میں اسے بحر قلزم کا نام دیا گیا ہے۔ یہی وہ دریا تھا جسے بنی اسرائیل نے فرعونیوں کی غلامی سے نجات پانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رفاقت میں موجودہ سویز اور اسماعیلیہ کے درمیان سے عبور کیا تھا۔ گویا اسی دریا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے پر راستہ بنا جہاں سے بنی اسرائیل پار ہو کر وادی سینا میں داخل ہوئے اور اسی جگہ فرعون غرق ہوا۔ اس کی شمالی حدود خلیج عقبہ سے لے کر شط العرب (خلیج عربی) تک پھیلی ہوئی ہے۔ HASTINGS کی 'DICTIONARY OF THE BIBLE', VOL., 1 COL., 585 کے مطابق بعض علمائے یہود کی رائے میں بلاد عرب کے جن علاقوں کا ذکر تورات میں ہے، وہ جزیرہ نمائے عرب ہی کے علاقے ہیں، اور اسماعیلی اور قطوری قبائل قدیم سے یہاں آباد ہیں۔

معروف کے مطابق جزیرہ نمائے عرب پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ ان حصوں کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ حجاز ۲۔ تہامہ ۳۔ یمن ۴۔ عروض ۵۔ نجد۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۲؎ ان کا سلسلۂ نسب اسماعیل بن ابراہیم الخلیل بن آزر ہے۔ یہ سام بن نوح کی نسل سے تھے۔ علمائے انساب عرب باشندوں کی تین اقسام بیان کرتے ہیں: بائدہ عاد، ثمود اور جرہم اولیٰ پر مشتمل ہیں، عاربہ یمنی ہیں اور قحطان کی اولاد میں سے ہیں اور عرب مستعربہ حضرت اسماعیل کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابن الوردی کی ایک رائے کے مطابق حضرت اسماعیل اپنی والدہ حضرت ہاجرہ کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے ۲۷۹۳ سال قبل حجاز کے علاقے میں آباد ہوئے۔ قرآن مجید (۱۴: ۳۷) میں اس کا ذکر آیا ہے۔ یہیں انھوں نے اپنی والدہ کی وفات کے بعد جرہم اولیٰ، جو کہ قحطانی النسل تھے، ان کی ایک عورت سے شادی کی۔ اس خاتون سے ان کے بارہ بیٹے ہوئے۔ ان میں سے ایک کا نام قیدار تھا جو بنی عدنان کا مورث اعلیٰ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انھی کی اولاد سے ہیں۔

یہاں آباد ہونے کے بعد انھوں نے اپنے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مل کر کعبۃ اللہ کی تعمیر میں حصہ لیا (۲: ۱۲۷)۔

آپ کی وفات مکہ ہی میں ہوئی اور آپ اپنی والدہ کے پہلو میں مقام حجر پر دفن ہوئے۔

۳؎ خزاعہ عمرو بن لحی کی اولاد سے ہیں، جو کہ قحطانی النسل تھا۔ بعض علمائے انساب نے انھیں مضری ہونے کے ناتے عدنانی قرار دیا ہے۔ لیکن اہل تحقیق کی اکثریت انھیں قحطانی ہی قرار دیتی ہے۔ یہ ابتدا میں مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام ابوا میں آ کر آباد ہوئے تھے، مگر بعد میں ان کی بعض شاخوں نے غزال، دوران اور عسفان کی وادیوں اور تہامۃ الحجاز کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ اور ان کے بعض قبیلے شام اور عمان کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔

انھیں تین سو سال تک بیت الحرام کی ولایت کا شرف حاصل رہا۔

۴؎ سبا کے بارے میں سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی لکھتے ہیں:

''سبا جنوبی عرب کی مشہور تجارت پیشہ قوم تھی جس کا دار الحکومت مآرب تھا جو موجودہ یمن کے دار السلطنت صنعاء سے ۵۵

میل بجانب شمال مشرق واقع ہے۔اس کا زمانۂ عروج معین کی سلطنت کے زوال کے بعد تقریباً ۱۱۰۰ق م سے شروع ہوا اور ایک ہزار سال تک یہ عرب میں اپنی عظمت کے ڈنکے بجاتی رہی۔ پھر ۱۱۵ق م میں جنوبی عرب کی دوسری مشہور قوم حمیر نے اس کی جگہ لے لی۔عرب میں یمن اور حضر موت، اور افریقہ میں حبش کے علاقے پر اس کا قبضہ تھا۔مشرقی افریقہ، ہندوستان ،مشرق بعید اور خود عرب کی جتنی تجارت مصر و شام اور یونان و روم کے ساتھ ہوتی تھی وہ زیادہ تر انھی سبائیوں کے ہاتھ میں تھی۔اسی وجہ سے یہ قدیم زمانہ میں اپنی دولت کے لیے نہایت مشہور تھی۔ بلکہ یونانی مؤرخین تو اسے دنیا کی سب سے زیادہ مال دار قوم کہتے ہیں۔تجارت کے علاوہ ان کی خوش حالی کا بڑا سبب یہ تھا کہ انھوں نے اپنے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر ایک بہترین نظام آب پاشی قائم کر رکھا تھا۔جس سے ان کا پورا علاقہ جنت بنا ہوا تھا۔ان کے ملک میں اس غیر معمولی سرسبزی و شادابی کا ذکر یونانی مورخین نے بھی کیا ہے۔اور سورۂ سبا کے دوسرے رکوع میں قرآن مجید بھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔'' (تفہیم القرآن ۵۶۸/۳۔۵۶۹)

یہ قوم بحر احمر کے شمالی کنارے پر یمن کی سرزمین پر آباد تھی۔حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت فلسطین و شام سے لے کر بحر احمر کے شمالی کناروں تک پھیلی ہوئی تھی ،لہٰذا یہ بدیہی امر ہے کہ وہ اس سلطنت اور اس کے حکمرانوں سے ضرور واقف ہوں گے۔ان کے والد ماجد حضرت داؤد علیہ السلام کی اس قوم سے واقفیت کی گواہی تو خود زبور میں موجود ہے:

''اے خدا، بادشاہ، (یعنی حضرت داؤد کو) اپنے احکام اور شاہزادے (یعنی حضرت سلیمان) کو اپنی صداقت عطا فرما......
ترسیس اور جزیروں کے بادشاہ نذریں گزرانیں گے۔سبا اور شیبا (یعنی سبا کی یمنی اور حبشی شاخوں) کے بادشاہ ہدیے لائیں گے۔'' (۷۲: ۱، ۲، ۱۰، ۱۱)

قرآن مجید میں سورۂ نمل میں ہدہد نے حضرت سلیمان کے سامنے اپنی غیر حاضری کی وجہ بیان کرتے ہوئے قوم سبا کے جو حالات بیان کیے ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کے لوگوں کا مذہب آفتاب پرستی تھا۔ابن اسحٰق کی تحقیق کے مطابق ان کے مورث اعلیٰ کا نام اپنے اسی مذہب کی رعایت سے عبد شمس تھا۔

۵؎ عرم کا لفظ عربی زبان میں زور دار بارش کے لیے استعمال ہوتا ہے۔اس کے علاوہ یہ لفظ (اگر اسے عرمہ کی جمع قرار دیا جائے تو) ان پتھروں کے لیے آتا ہے جو تہ بہ تہ اکٹھے کیے گیے ہوں۔اقرب الموارد میں اس لفظ کا مطلب 'سد یعترض به الوادی' بیان ہوا ہے جس کے معنی اس بند کے ہیں جو کسی وادی کے بیچ میں بنایا جائے۔

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم سبا نے اپنے علاقے میں دو پہاڑوں کے درمیان میں ایک بہت بڑا بند تعمیر کیا تھا۔ یہ بند انھیں ایک جانب سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھتا تھا اور دوسری طرف یہاں سے نہریں نکال کر انھوں نے اپنے ہاں آب پاشی کا شان دار نظام قائم کر رکھا تھا۔اسی نظام آب پاشی پر ان کی زمینوں کی سرسبزی اور شادابی اور ان کی خوش حالی کا دارومدار تھا۔گویا ہمارے منگلا اور تربیلا ڈیم کی طرح یہ کئی میل لمبا اور کئی میل چوڑا ایک بند تھا۔تاریخوں میں اس کا ذکر سد مأرب کے نام سے آتا ہے۔

سورۂ نحل کی آیت ۱۱۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی جانب رسول بھیجا۔قوم کے لوگوں نے اپنے رسول کے انذار کو پس پشت ڈال کر سرکشی اختیار کیے رکھی۔اس کے نتیجے میں ان پر اللہ کا عذاب آیا۔اور اس عذاب کی صورت یہ ہوئی کہ سد مأرب ٹوٹ گیا۔

اس کا بے پناہ پانی تباہی پھیلاتا ہوا چاروں طرف بہ نکلا اور اس وقت کی آباد دنیا کا زرخیز ترین خطہ تاراج ہو کر رہ گیا۔

۶؎ اوس وخزرج دونوں حارثہ بن تعلبہ کے بیٹے تھے۔ یہ ازدی اور قحطانی النسل تھے۔ یہ یمن سے ہجرت کر کے یثرب میں آباد ہوئے تھے۔ دور جاہلیت کا مشہور بت منات انھی قبیلوں میں پوجا جاتا تھا۔

جب اسلام کا ظہور ہوا تو اوس کے سردار سعد بن معاذ بن نعمان بن اُمری ءالقیس تھے اور خزرجیوں کی سیادت سعد بن عبادہ بن دلیم بن حارثہ کے پاس تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی نبوت کا اعلان کیا تو دونوں ایمان لے آئے۔ اس کے نتیجے میں ان کے قبیلوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اور ہجرت کے وقت انھیں انصاری ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

۷؎ قرآن مجید کی یہ آیت سورۂ حجرات کے دوسرے پیرے کی آخری آیت ہے۔ یہ پیرا تین آیات پر مشتمل ہے اور آیت ۱۱ سے شروع ہوتا ہے۔ اس پیرے میں اہل ایمان کو ان باتوں سے روکا گیا ہے جو دلوں میں بدی کی ایسی تخم ریزی کا باعث بنتی ہیں کہ اس کے نتیجے میں پورے معاشرے کے مسموم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اگر بر وقت اس کا سد باب نہ کیا جائے تو رحماء بینھم کی صفت کے اعداء بینھم میں بدل جانے کا شدید خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کی شکلوں، رنگوں اور ان کے قد وقامت کی طرح نسلوں قبیلوں اور خاندانوں کا فرق بھی محض اس لیے ہے کہ انھیں بس اپنی پہچان کا ذریعہ سمجھا جائے۔ دینی اعتبار سے ایسی چیزوں کے ساتھ کبھی بھی کسی قسم کا شرف وتفوق وابستہ نہیں ہوتا۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سلیم صافی

مسئلۂ افغانستان

افغانستان ایک تعارف

پاکستان کی مغربی اور شمالی سرحد پر واقع غیور افغانوں کی سرزمین افغانستان کا کل رقبہ ۶ لاکھ ۴۷ ہزار ۵ سو مربع کلومیٹر ہے۔ بلند و بالا کہساروں، حسین باغات اور لق و دق صحراؤں پر مشتمل افغانستان قدیم دور سے لے کر اب تک وسطی اور جنوبی ایشیا کے درمیان پل کا کام دے رہا ہے۔ اس نے ہر دور میں وسطی اور جنوبی ایشیا کی سیاست و معاشرت پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے ہیں، جبکہ خود افغانستان بھی ان دونوں اطراف سے بے انتہا اثر قبول کرتا رہا ہے، تاہم اس حوالے سے وسطی ایشیا کا پلڑا جنوبی ایشیا پر بھاری ہے۔ بلکہ کچھ حوالوں سے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ افغانستان وسطی ایشیا سے اثر لیتا اور جنوبی ایشیا کو متاثر کرتا رہا ہے۔ ساحل سمندر سے محرومی نے اگرچہ افغانستان کو بہت ساری چیزوں سے محروم بھی کر رکھا ہے، لیکن یہ محرومی اسے پڑوسی ممالک کے ساتھ اور پڑوسی ممالک کو اس کے ساتھ تجارتی روابط پر مجبور کر دیتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اس کی ایشیا کا دل ہونے کی حیثیت برقرار رہی ہے۔ افغانستان کی خطے کے اہم ملک چین کے ساتھ ۷۶ کلومیٹر، ایران کے ساتھ ۹۳۶ کلومیٹر، پاکستان کے ساتھ ۲۴۳۰ کلومیٹر، تاجکستان کے ساتھ ۱۲۰۶ کلومیٹر، ترکمانستان کے ساتھ ۷۴۴ کلومیٹر اور ازبکستان کے ساتھ ۱۳۷ کلومیٹر سرحد مشترک ہے۔ جس طرح افغان عوام بے پناہ ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہوئے بھی جنگوں کی وجہ سے کسی بھی مثبت رخ میں اپنی ان صلاحیتوں کا استعمال نہیں کر سکے، اسی طرح بے پناہ قدرتی وسائل سے مالا مال ہو کر بھی افغان سرزمین، اپنے سینے پر ہونے والی مسلسل جنگوں کی وجہ سے افغان عوام کو خوش حالی دینے میں ناکام رہی ہے۔ افغانستان کے کہساروں میں قدرتی گیس، پٹرولیم، کوئلے، تانبے، کرومائٹ اور قیمتی پتھروں سمیت، کئی دیگر معدنیات کے بے پناہ ذخائر بکثرت پائے جاتے ہیں۔ افغانستان کے میوہ جات بالخصوص انگور، انار اور خربوزے پوری دنیا میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اسی طرح جنوب کے صحرائی علاقے کو چھوڑ کر باقی افغانستان کی زمین انتہائی زرخیز ہے۔ مجاہد رہنما گلبدین

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حکمت یار، جب وہ کابل پر قبضے کے لیے احمد شاہ مسعود کی فوجوں سے برسرپیکار تھے، سے ایک روز کسی نے استفسار کیا کہ آپ لوگوں نے تو افغانستان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اب اگر آپ افغانستان پر قابض ہو بھی جائیں تو اس کا کیا کریں گے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے گلبدین حکمت یار نے کہا تھا ''افغانستان کی زمین ایک سونا نہیں اگلتی باقی یہاں ہر نعمت اگتی ہے۔ اللہ نے ہمیں جو زمین اور جو آب و ہوا دے رکھی ہے، اس کی وجہ سے ہم اپنی معیشت کو چاند لگا سکتے ہیں اور اگر دس سال بھی یہاں امن قائم رہے تو افغانستان کی معیشت جاپان کی معیشت سے آگے نکل جائے گی۔'' حکمت یار کا یہ جواب بڑی حد تک مبالغہ آمیز ضرور ہے، لیکن اس سے افغان سرزمین کی زرخیزی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

کابل افغانستان کا دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی ۱۹۹۴ء میں اقوام متحدہ کے جمع کردہ اعداد و شمار کے مطابق آٹھ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ ماضی میں احمد شاہ ابدالی اور حال میں طالبان کی وجہ سے شہرت پانے والا قندھار دوسرا بڑا شہر ہے جس کی آبادی دو لاکھ چھبیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ جنوب مغرب میں واقع، ایران کی سرحد سے متصل ہرات (آبادی پونے دو لاکھ) کو تیسرے اور شمال میں واقع مزار شریف (آبادی ایک لاکھ اکتیس ہزار) کو چوتھے بڑے شہر کی حیثیت حاصل ہے۔ پاکستانی سرحد کے قریب واقع مشرقی شہر جلال آباد اور تاجکستان کی سرحد سے متصل کندوز بھی افغانستان کے بڑے شہروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انتظامی لحاظ سے افغانستان صوبوں (ولایت) اور نچلی سطح پر ضلعوں (اولسوالی) میں منقسم ہے۔ مجموعی رقبے کے لحاظ سے اگرچہ افغانستان امریکی ریاست ٹکساس سے چھوٹا ہے، لیکن صوبوں کی تعداد بتیس ہے۔ بدخشان، بادغیس، بغلان، بلخ، بامیان، فرح، فاریاب، غزنی، غور، ہلمند، ہرات، جوزجان، کابل، قندھار، کاپیسا، کونڑ، کندوز، لغمان، لوگر، ننگرہار، نیمروز، اورزگان، پکتیا، پکتیکا، پروان، سمنگان، سرائے پل، تخار، وردگ اور زابل پہلے سے افغانستان کے صوبے چلے آ رہے تھے جب کہ ڈاکٹر نجیب اللہ کے دور حکومت میں نورستان اور خوست کے نام سے دو مزید صوبے بھی بنا دیے گئے۔

افغانستان دنیا کا وہ بدقسمت ترین ملک ہے جس کے مکین اپنے وسائل اور آبادی کا اندازہ لگانے کے لیے بھی غیروں کے مرتب کردہ اعداد و شمار پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں۔ گزشتہ تین عشروں کی مسلسل لڑائیوں کی وجہ سے افغانستان مرکزی نظام اور منظّم اداروں سے یک سر محروم ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود رائے شماری کر سکا نہ اپنے وسائل کے بارے میں اعداد و شمار اکٹھا کر سکا اور آج افغانستان کی مختلف قومیتیں اپنی آبادی کے بارے میں مختلف دعوے کر رہی ہیں۔ اسی طرح بیرون ملک ذرائع کے مرتب کردہ اعداد و شمار میں بھی بسا اوقات زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اقوام متحدہ اور امریکی سی آئی اے کی مرتب کردہ رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۱ء میں افغانستان کی کل آبادی ۲ کروڑ ۶۸ لاکھ تھی، تاہم اسے ایک اندازہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ سوویت یونین نے اپنے تسلط کے دنوں میں جو مردم شماری کرائی، اس کی رو سے افغانستان میں پختونوں کی آبادی کا تناسب ۶۲ فی صد ہے۔ چند سال قبل اقوام متحدہ کے اداروں نے جو سروے کیا، اس کے مطابق ان کا تناسب ۳۸ فی صد

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بتایا جاتا ہے۔ امریکی حکومت سمیت بیشتر مغربی ممالک اور میڈیا کے ادارے اقوام متحدہ کے اس دعوے پر یقین کرنے لگے ہیں جس کی وجہ سے پختونوں کی آبادی کے تناسب کے بارے میں ۳۸ فی صد کا تصور عالمی سطح پر عام ہو گیا ہے، تاہم چند سال قبل واک فاؤنڈیشن نامی ایک تنظیم نے جو مردم شماری کرائی اس کی رو سے افغانستان میں پختونوں کا تناسب ۵۲ فی صد ہے۔ ممتاز صحافی اور افغان امور کے ماہر رحیم اللہ یوسف زئی نے ۶۲ فی صد کے دعوے کو حقیقت سے قریب تر قرار دیا جب کہ ''طالبان'' کتاب کے مصنف احمد رشید کے مطابق پختونوں کی آبادی کی شرح چالیس فی صد ہے۔ بہر حال ایک بات جس پر ہر طبقے اور ہر ادارے کا اتفاق ہے، یہ ہے کہ افغانستان میں پختونوں کو واضح اکثریت حاصل رہے۔ پختونوں کی غالب اکثریت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ افغانستان کی معلوم تاریخ میں بیشتر اوقات تخت کابل پختونوں کے پاس ہی رہا۔ بچہ ثقاؤ کے بعد برہان الدین ربانی کی صورت میں دوسری مرتبہ یہ حکومت تاجکوں کے حصے میں آئی، لیکن بون کانفرنس کے نتیجے میں ایک بار پھر افغان حکومت کی قیادت حامد کرزئی کی صورت میں افغانستان کے فطری حکمرانوں یعنی پختونوں کے حصے میں آ گئی۔ پختونوں کے بعد تاجک قوم کو دوسری، ہزارہ کو تیسری، ایمق کو چوتھی، ازبک کو پانچویں اور ترکمن کو چھٹی قومیت کا درجہ حاصل ہے۔ اسی طرح نورستانی اور قزلباش قومیتوں کی بھی ایک قابل ذکر تعداد افغانستان میں موجود ہیں۔ پشتونوں کی اکثریت دو بڑے قبیلوں یعنی درانی اور غلزئی پر مشتمل ہے۔ اسی طرح صافی، شینواری اور متعدد دیگر پختون قبیلوں کے لوگ بھی افغانستان کے مختلف خطوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مشرقی اور جنوبی افغانستان کو خالصتاً پشتونوں کا علاقہ قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کابل کے جنوب مغرب میں واقع علاقے بھی روایتی طور پر پختونوں کا ہی خطہ تصور کیے جاتے ہیں، لیکن شمالی اور وسطی افغانستان کے بہت سارے علاقوں تک بھی پختون بڑی تعداد میں پھیل گئے ہیں۔ مثلاً کندوز تاجکستان کی سرحد سے متصل افغانستان کا انتہائی شمالی صوبہ ہے، لیکن یہاں پر پختونوں کی بڑی تعداد مقیم ہے حتیٰ کہ گلبدین حکمت یار، جن کی تنظیم حزب اسلامی کو جہادی تنظیموں میں پختونوں کا نمائندہ تصور کیا جاتا تھا بھی اسی صوبے کے ایک علاقے امام صیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری بڑی قومیت یعنی تاجک زیادہ تر کابل شہر، بدخشان اور کاپیسا کے صوبوں میں مقیم ہیں، لیکن دوسری طرف انتہائی جنوبی صوبے یعنی ہرات میں بھی تاجکوں کی ایک بڑی تعداد نے سکونت اختیار کر رکھی ہے۔ اسی طرح بعض دیگر صوبوں میں بھی جگہ جگہ ان کے پاکٹس پائے جاتے ہیں۔ منگولوں کی نسل سے تعلق رکھنے والے ہزارہ نسل کے لوگ وسطی افغانستان میں مقیم ہیں۔ ان کے اس علاقے کو ہزارہ جات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور بامیان صوبے کو اس کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ ایمق جنھیں بیشتر مورخین ترک قرار دے رہے ہیں، افغانستان کے وسطی پہاڑی سلسلے کے مغربی علاقوں میں بس گئے ہیں۔ کوہ ہندوکش کے شمال کا علاقہ ازبک قوم کا علاقہ تصور کیا جاتا ہے اور مزار شریف کو ان کے مرکز اور اہم شہر کا درجہ حاصل ہے۔ جنوب مشرقی افغانستان میں بلوچ اقلیت کے کچھ قبیلے بھی آباد ہیں۔

افغانستان کی ننانوے فی صد سے زائد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے جن میں تقریباً اسی فیصد سنی ہیں۔ ہزارہ قوم سے تعلق

رکھنے والے افراد تقریباً سو فی صد شیعہ ہیں۔ اسی طرح قزلباش اور اسماعیلی برادری کے لوگوں کو بھی شیعہ تصور کیا جاتا ہے۔ جلال آباد، کابل اور بعض دیگر علاقوں میں سکھوں اور ہندووں کی ایک محدود تعداد بھی آباد ہے۔ سنی افغان زیادہ تر حنفی مسلک پر عمل پیرا ہیں۔ افغانیوں کے دین کا وہی تصور ہے، جو عام دیو بند مولویوں کے ہاں رائج ہے۔ ایران کی طرح اگرچہ افغانستان میں ملا کو فیصلہ کن حیثیت حاصل نہیں، لیکن پاکستان کے مقابلے میں افغانستان میں ملا کو اہمیت اور احترام حاصل ہے۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے چونکہ لوگ دیگر ذرائع سے دینی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے اس لیے تقریباً تمام تر انحصار مسجد کے مولوی پر کیا جاتا ہے۔ افغانستان کے پختون علاقوں میں کسی حد تک پیری مریدی بھی رواج پا گئی ہے، لیکن وہاں بریلویت اس طرح مستحکم نہیں ہوئی، جیسا کہ پاکستان میں ہو گئی ہے۔ افغانستان کے بعض علاقوں بالخصوص شمال مشرقی صوبوں یعنی کونڑ اور نورستان وغیرہ میں اہل حدیث مسلک کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے۔ جب کہ ان علاقوں میں صوبۂ سرحد کے نامور عالم مولانا محمد طاہر کے پیرو کار بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ مجاہد رہنما استاد سیاف جن کا تعلق کابل کے مغرب میں واقع پغمان سے ہے، کی تنظیم کے وابستگان بھی اہل حدیث مسلک کے پیرو ہیں اور انھیں افغانستان میں وہابی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ شیعہ آبادی کے لوگ یعنی ہزارہ ایران کے زیر اثر ہیں اور عملی زندگی میں وہ اپنے مسلک پر سختی سے کاربند نظر آتے ہیں۔ نورستان صوبہ جو کسی زمانے میں کافرستان کہلاتا تھا کے باشندوں نے آج سے تقریباً سو سال قبل اسلام قبول کیا۔ اسی طرح افغانستان کے اندر اسماعیلی فرقے کے لوگ بھی وسطی اور شمالی افغانستان میں پائے جاتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معاشرت و ثقافت

افغانستان کی زمینی، مذہبی اور لسانی ساخت میں موجود تنوع کی طرح معاشرتی لحاظ سے بھی یہاں بے انتہا تنوع پایا جاتا ہے۔ پختون پٹی کے لوگ قبائلی مزاج کے حامل اور شدت کی حد تک روایت پسند ہیں۔ طالبان سے قبل یہاں تقریباً ہر حکومت کا ریاستی کنٹرول نہایت ڈھیلا رہا اور حکومتی قوانین کے مقابلے میں لوگ جرگے اور رسم و رواج کے زیادہ تابع رہے۔ ان علاقوں کے لوگ مذہب سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں اور ان کے ہاں اسلامی اقدار یعنی نماز، روزے، داڑھی اور پردے کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔ قبائلی دشمنیاں اور تنازعات بھی یہاں کی معاشرت کا لازمی حصہ ہیں۔ وسطی افغانستان کی شیعہ آبادی کو بھی قدامت پسند تصور کیا جاتا ہے، لیکن یہاں کی آبادی میں قبائلی خصائص کچھ کم ہیں۔ ازبک لوگ نسبتاً زیادہ آزاد خیال اور جدت پسند ہیں۔ شمال میں واقع شہر مزار شریف پر نہ صرف وسط ایشیائی ممالک کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں، بلکہ یہاں کا ماحول بھی بہت حد تک شہری بن گیا ہے۔ اسی طرح تاجک آبادی کو بھی لبرل اور جدت پسند تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں قبائلی اور مذہبی روایات اس قدر پختہ نہیں جس طرح کہ پختون پٹی میں ہیں۔ دار الحکومت کابل ماضی قریب میں کئی مراحل سے گزرا

ہے۔ یہ شہر ظاہر شاہ اور ان کے بعد کمیونسٹوں کے دور میں انتہائی جدت کا حامل رہا۔ کسی زمانے میں یہاں یورپ کی طرح گلیوں میں اسکرٹ پہنے لڑکیاں بھی دیکھنے کو ملتی تھیں۔ اس شہر نے روشن خیالی اور آزادروی کا بے انتہا اثر قبول کیا۔ مجاہدین کے قبضے کے بعد سوشلزم اور جدت پسندی کے علم بردار، زیادہ تر لوگ پڑوسی ممالک اور امریکا و یورپ کا رخ کر گئے تاہم اس دور میں بھی یہ شہر بڑی حد تک افغانستان کے دیگر شہروں سے یکسر مختلف رہا اور آزاد خیالی کے اثرات بدستور واضح دکھائی دے رہے تھے، البتہ طالبان کے قبضے کے بعد ایک اور انتہا نے اس خوبصورت شہر کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ تب آزاد خیال اور لبرل لوگ ایک ایک کر کے اس شہر سے کوچ کرنے لگے، جو باقی رہ گئے انھوں نے طالبان کے ٹھیٹھ نظام کے تحت زندگی گزارنی شروع کی۔ عمارتیں مختلف ضرور تھیں، لیکن عملاً کابل دوسرا قندھار بن گیا تھا۔ طالبان حکومت کے خاتمے اور کرزئی حکومت کے قیام کے بعد کابل شہر نے ایک بار پھر جدت پسندی کی طرف سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ ابتدائی چند دنوں میں ٹی وی، وی سی آر، ڈش انٹینا اور آڈیو کیسٹ فروخت کرنے والی درجنوں دکانیں کھل گئیں۔ لبرل اور آزاد خیال لوگ کابل میں واپس آنے لگے ہیں اور شراب و کباب کی محفلیں ایک بار پھر سجتی دکھائی دے رہی ہیں۔

گزشتہ تیس سال کے واقعات نے افغان معاشرے پر نہایت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ پاکستان ہجرت کرنے والے افغانیوں نے پاکستانی معاشرے، ایران جانے والوں نے ایران کے معاشرے اور یورپ و امریکا جانے والوں نے وہاں کے معاشروں سے غیر معمولی اثر لیا ہے۔ ہجرت سے قبل افغانستان میں کبڈی، والی بال اور بزکشی جیسے کھیل مقبول تھے اور کرکٹ کا نام بھی سننے کو نہیں ملتا تھا، لیکن اب پاکستان کی طرح افغانستان میں بھی کرکٹ ایک مقبول کھیل بن گیا ہے۔ پڑوسی ممالک سے اثر لینے کا یہ عمل اس قدر زیادہ ہے کہ افغانستان کا جو شہر جس ملک کے قریب واقع ہے، بسا اوقات اس شہر پر اسی ملک کے کسی شہر کا گمان ہوتا ہے۔ اب ہرات ایران کے کسی شہر کا، جلال آباد پشاور کا، تخار تاجکستان کا اور مزار شریف وسط ایشیائی ملک کے شہر کا منظر پیش کرنے لگے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

خصائص کے لحاظ سے افغان قوم نہ صرف دنیا بھر میں منفرد، بلکہ بسا اوقات اس کی مختلف خصلتیں ایک دوسرے سے بہت متضاد نظر آتی ہیں۔ بنیادی طور پر افغان انتہاؤں کے بیچ جینے والی قوم ہے۔ مثلاً انفرادی طور پر افغان دوستی میں انتہائی پکے واقع ہوتے ہیں۔ مہمان نواز اس قدر ہیں کہ مہمان کی خاطر سب کچھ لٹانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ یاری دوستی اور روایات کی خاطر جان تک کی قربانی دینا افغانوں کا وطیرہ رہا ہے، لیکن دوسری طرف بحیثیت قوم افغانوں کی دوستیاں اور دشمنیاں چنداں مستقل نہیں رہتیں۔ سیاسی گروہوں کو دیکھ لیں۔ آج ایک گروہ کسی ملک کا ساتھی ہے تو کل وہی گروہ اسی ملک کا دشمن اور اس کے دشمن ملک کا ساتھی بن جاتا ہے۔ بے شک اس میں کچھ سیاسی مجبوریوں کا بھی دخل ہے، لیکن بہر حال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کسی زمانے میں گلبدین حکمت یار، ایران کے شدید ترین مخالف تھے اور چند سال بعد انھوں نے اسی ایران کو اپنا مستقر بنا لیا۔ پروفیسر برہان الدین ربانی اور احمد شاہ مسعود نے تقریباً دو عشروں تک سوویت یونین کے خلاف جدوجہد کی، لیکن گزشتہ

چند سالوں سے وہ روس اور وسط ایشیائی ریاستوں کی امداد کے سہارے لڑتے رہے۔ خود طالبان نے ابتدائی دنوں میں امریکی اداروں سے امداد وصول کی۔ پروفیسر ربانی اور رشید دوستم بھی ان کو سپورٹ کرتے رہے، لیکن پھر یہی طالبان امریکا، ربانی اور دوستم کے شدید دشمن بن گئے۔ یہی معاملہ دیگر سیاسی گروہوں کا بھی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو افغانوں کو انتہائی ناقابل اعتبار قوم تصور کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے قبائلی پختونوں اور افغانوں کے بارے میں یہ ایک عام تاثر ہے کہ وہ توپوں کے آگے تو ٹھیر جاتے ہیں لیکن نوٹوں کے آگے نہیں ٹھیر سکتے۔ قبائلیوں اور افغانوں کی اس کمزوری پر غور کرنے سے جو وجوہات سامنے آتی ہیں، ان میں سر فہرست تو غربت اور پس ماندگی ہے، لیکن قبائلیوں کے اس مزاج کو بنانے میں انگریزوں نے بھی بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ برصغیر پر قبضے کے بعد جب انگریز پختون قبائلیوں اور افغانوں کو زیر نہ کر سکا تو اس نے انھیں مالی رشوتیں دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ افغانوں اور پاکستان میں رہنے والے پختون قبائلیوں کی صفوں میں پیسے کے آگے جھکنے کی بیماری عام ہونے لگی، تاہم افغانوں کے اس مزاج کو مہمیز گزشتہ تیس سالوں کی لڑائیوں نے کیا۔ ایک طرف سوویت یونین نے اپنے حامیوں کے آگے روبلوں کے انبار لگا دیے تو دوسری طرف مجاہدین امریکی ڈالروں، سعودی ریالوں اور پاکستانی روپوں کی بوریوں سے آشنا ہو گئے۔ ڈالر، ریال اور روپے نے سوویت یونین کی شکست، طالبان کے عروج اور زوال میں بنیادی کردار ادا کیا۔ طالبان کے بعد جو حکومت برسر اقتدار آئی ہے، اس کے قائم ہونے میں بھی نہ صرف مذکورہ عامل نے بنیادی کردار ادا کیا، بلکہ اس کے ثبات و استحکام میں بھی اسی عامل کو بنیادی اہمیت حاصل رہے گی۔ ننگرہار صوبے کے سابق گورنر اور سابق نائب صدر حاجی عبدالقدیر، جنھیں جولائی ۲۰۰۲ء کے اوائل میں کابل کے اندر قتل کر دیا گیا، کے بارے میں تو یہ بات اب ایک کھلا راز ہے کہ انھوں نے طالبان کے زوال کے بعد جلال آباد پر قابض ہونے والے کمانڈروں سے ننگرہار صوبے کی گورنرشپ رقم دے کر خریدی تھی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

افغان مزاج کی ان انتہاؤں اور تضاد کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً وہ اپنی مٹی اور ملک سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ دنیا کی پس ماندہ ترین اور مظلوم ترین قوم ہونے کے باوجود جس قدر افغان، اپنے افغان ہونے پہ فخر کرتا ہے، دیگر نسلوں کے لوگ شاید اس احساس تفاخر کا صرف تصور ہی کر سکتے ہیں۔ افغانستان موسیقی کے حوالے سے بہت مالا مال ہے۔ اس کی موسیقی کے سر، تال اور آہنگ کا کوئی ثانی نہیں۔ افغان جس قدر فن موسیقی کے رموز سے آشنا ہیں، دوسری قوموں کو بجا طور پر ان پر رشک کرنا چاہیے۔ شاعری میں افغان، پاکستان میں رہنے والے پختونوں سے بہت پیچھے ہیں۔ ان کے ہاں کبھی بھی رحمٰن بابا، خوشحال خان خٹک، غنی خان، حمزہ شینواری یا رحمت شاہ سائل جیسا مستند شاعر پیدا نہیں ہوا، تاہم افغانوں کی اپنی جتنی شاعری موجود ہے، وہ وطن اور مٹی کی محبت سے بھری ہے۔ غزل ہو یا نظم، ٹپہ ہو یا چاربیتہ ہر صنف کی شاعری پر وطن کی محبت کی چھاپ نمایاں ہے۔ شاعری کے لحاظ سے پاکستان میں واقع پختون پٹی بہت زرخیز ہے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وطن کی محبت، افغانیت اور پشتونولی کے حوالوں سے جو نظمیں، سرحد کے اس پار کے شاعروں نے تخلیق کی ہیں، وہ زیادہ تر

افغانستان میں گائی اور سنی جاتی ہیں۔اس سے بھی اپنی مٹی کے ساتھ افغانوں کی غیر معمولی محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ افغانی شاید گالی سننے پر اس قدر آپے سے باہر نہیں ہوتے، جس قدر وہ اپنے وطن اور اپنی قوم کے خلاف بات سن کر ہوجاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک انتہا ہے، لیکن دوسری طرف غیروں کے اشارے پر اپنے وطن اور اپنے اثاثوں کو برباد کرنے کی حماقت کے بھی افغان سب سے زیادہ مرتکب ہورہے ہیں۔ اپنی معمولی انا اور خواہش کی خاطر افغان لیڈروں نے نہ صرف اپنے شہروں کو کھنڈر بنا دیا، بلکہ اپنے ہزاروں ہم وطنوں کو لقمۂ اجل بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔مجاہدین کے قبضے کے بعد، افغان رہنماؤں نے وطن کی ہر چیز حتیٰ کہ بجلی کے کھمبوں تک کو اکھاڑ کر سکریپ کی صورت میں فروخت کیا۔ میں نے خود افغان مجاہدین کوٹینکوں میں جانوروں کے لیے چارہ لاتے اور کلاشنکوف کی گولیاں فائر کر کے مچھلیوں کا شکار کرتے دیکھا ہے۔مجاہدین لیڈر ہیلی کاپٹروں اور جہازوں کو اس طرح استعمال کرتے رہے، جیسے وہ جہاز اور ہیلی کاپٹر نہیں، بلکہ کھلونے ہوں۔ایک اور حوالے سے دیکھا جائے تو افغانستان کی مٹی اگر ایک طرف ملا محمد عمر جیسے لوگوں کو جنم دے رہی ہے، جن کی افغانیت، مذہبیت اور مسلکیت اپنی انتہاؤں کو چھو رہی ہے تو دوسری طرف افغانوں ہی کی صفوں سے زلمے خلیل زاد جیسے لوگ بھی پیدا ہوتے ہیں، جو محض تیس سال تک امریکا میں قیام کی وجہ سے، ان کے رنگ میں اس قدر رنگ گئے کہ آج اپنے ہی باپ دادا کی زمین کے لیے امریکی صدر بش کے خصوصی نمائندے بن کر امریکی مہمان کی حیثیت سے کابل لوٹے ہیں۔

افغان بحیثیت مجموعی مذہبی لوگ ہیں۔نماز، روزے اور دیگر اسلامی شعائر کی پابندی کا جو مظاہرہ افغانستان میں دیکھنے کو ملتا ہے، شاید ہی وہ سعادت دنیا میں کہیں اور مسلمان قوم کو نصیب ہو۔ دنیا کی دیگر اقوام کے لوگ جب طالبان کے ہاتھوں جبراً داڑھیاں رکھوانے کا تصور کرتے ہیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیشتر افغانوں نے اپنی مرضی سے داڑھیاں رکھی ہوئی ہیں۔اسی طرح افغانستان میں بحیثیت مجموعی خواتین پردے کا اہتمام کرتی ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں طالبان کے علاقوں سے ہوتا ہوا میں کونڑ صوبے میں احمد شاہ مسعود کے اتحادی کمانڈر کشمیر خاں، جو ماضی میں گلبدین حکمت یار کے قریبی ساتھی تھے، کے زیر قبضہ علاقے شیگل میں دس پندرہ روز مقیم رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگوں کا طرز زندگی بعینہٖ ویسے تھا جیسا کہ کونڑ اور ننگر ہار صوبوں میں طالبان کے زیر قبضہ علاقوں میں تھا۔کشمیر خان نے اپنے علاقے میں داڑھی کی پابندی لگا رکھی تھی نہ خواتین کے پردے کے لیے کوئی قانون موجود تھا۔ میں ان دس پندرہ دنوں میں ضلع شیگل کے تقریباً ہر گاؤں میں گیا، لیکن مجھے کوئی ایک آدمی بھی داڑھی کے بغیر دکھائی نہیں دیا۔اسی طرح ایک خاتون بھی برقعہ اوڑھے بغیر دیکھنے کو نہیں ملی۔ وہاں کے تقریباً تمام لوگ پانچ وقتہ نمازی تھے اور بیشتر مساجد میں درس قرآن دیے جاتے تھے۔تنازعات کے تصفیے اور حدود و تعزیرات پر عمل درآمد کے لیے علما پر مشتمل ایک جرگہ تشکیل دیا گیا تھا، جو شرعی قوانین کے مطابق فیصلے کر رہا تھا۔اس صورت حال سے، مذہب کے ساتھ افغانوں کے لگاؤ کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ گروہی، جماعتی اور قبائلی لڑائیوں کے چھڑ جانے کے بعد افغان مذہبی احکامات بھی پامال کرنے سے گریز نہیں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کرتے۔ مثلاً طالبان ۱۹۹۶ء سے لے کر ۲۰۰۱ء تک مذکورہ حاجی کشمیر خان کے ساتھ بھی مسلسل لڑائیوں میں مصروف رہے اور اس دوران میں شیگل پر قبضے کے لیے انھوں نے متعدد بڑے حملے کیے تھے۔ تورہ بورہ اور شاہی کوٹ میں ہلاک ہونے والے القاعدہ کے لوگوں کو اسلامی طریقے کے مطابق دفنانے کی خاطر ان علاقوں کے عوام نے امریکیوں سے ٹکر لے کر، اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگایا، لیکن یہ اندوہ ناک واقعات بھی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں کہ ایک طرف اگر جنرل مالک نے مزار شریف کے قریب ہزاروں طالبان کو اجتماعی قبر میں دفن کیا تو دوسری طرف بامیان، شین ڈنڈ اور ہرات میں طالبان کے دور کی بھی متعدد اجتماعی قبریں دریافت ہوئی ہیں۔ ایک طرف یہ انتہا دیکھ لیجیے کہ القاعدہ کے غیر ملکی مجاہدین کو دفن کرنے کے لیے افغان عوام، دینی جذبے کے تحت، اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگا رہے ہیں اور دوسری طرف اس انتہا کا نظارہ کر لیجیے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو سیاسی لڑائی کی وجہ سے اجتماعی قبروں میں دفن کیا جاتا رہا۔

اپنی فطرت کے لحاظ سے افغان حریت پسند واقع ہوئے ہیں۔ آزادی ان کی سب سے محبوب چیز ہے۔ اپنی نسل، اپنے قبیلے اور اپنے بزرگوں کے سوا کسی اور کی حکمرانی اور احترام کو وہ گوارا نہیں کر سکتے۔ میں نے افغانوں اور پاکستان کے پختون قبائلیوں کی اس خاصیت کو خصوصی طور پر نوٹ کیا ہے کہ وہ مرنے مارنے پر تو بڑی آسانی سے تل جاتے ہیں، لیکن قیدی بن کر جیل جانے سے بہت گھبراتے ہیں۔ اسی طرح جنگی محاذوں پر میں نے ان کی اس روش کا بھی کئی بار نظارہ کیا کہ وہ توپ اور جہاز کا سامنا کرنے سے تو نہیں گھبراتے تھے، لیکن جس راستے میں بارودی سرنگیں بچھی ہوتی تھیں، وہ بڑی مشکل سے اس راستے پر سے گزرنے کے لیے تیار ہوتے۔ میں نے کئی افغانوں سے اس بارے میں استفسار کیا تو ان کی طرف سے عموماً یہی جواب سامنے آیا کہ توپ اور جہاز سے گرنے والا بم تو زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے، لیکن بارودی سرنگ مارنے کے بجائے اپاہج بنا دیتی ہے جس کے بعد انسان کو محتاجی کی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ گویا وہ محتاجی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ افغان اپنی آزادی کی خاطر ہر وقت، ہر طرح کی قربانی دینے پر آمادہ رہتا ہے۔ اسی لیے افغانوں نے وقت کی ہر سپر طاقت سے ٹکر لی۔ بے انتہا قربانیاں دیں اور ہر حالت میں اپنی آزادی اور خود مختاری کو یقینی بنایا۔ لیکن اس معاملے میں بھی افغانوں کو ایک مصیبت لاحق ہے اور وہ یہ کہ دوست بنا کر اور لالچ دے کر انھیں بڑی آسانی سے غلام بنایا جا سکتا ہے۔ سوویت یونین دوست کے روپ میں افغانستان میں داخل ہوا تھا۔ وہ لالچ دے کر افغانوں کو ساتھ ملا رہا تھا۔ پھر جو اس کے دوست بنے، وہ از خود ان کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالتے رہے۔ یہی معاملہ سوویت یونین کے خلاف مزاحمت کرنے والے مجاہد گروپوں کا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ کے دنوں میں اور اس کے بعد، وہ سب کے سب عملاً امریکا اور پڑوسی ممالک کی کٹھ پتلیوں کا کردار ادا کرتے رہے، لیکن چونکہ نام دوستی کا تھا اس لیے انھیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنی غلامی کا احساس نہیں ہوا۔ مجاہد گروپوں کی گزشتہ دس سالہ اندرونی لڑائیوں پہ نظر ڈال لیجیے تو بھی بڑی دلچسپ صورت حال سامنے آتی ہے۔ ملک کے اندر ان میں سے ایک بھی گروہ دوسرے کی بالادستی کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا، لیکن عملاً وہ کسی نہ کسی بیرونی ملک کا دست نگر اور کٹھ پتلی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تھا۔ یہاں اب موقع نہیں ورنہ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اگر دسمبر ۱۹۷۹ء سے لے کر اپریل ۱۹۹۲ء تک افغانوں نے اپنے سروں کی قیمت پر سوویت یونین اور امریکا کی جنگ لڑی تو اس کے بعد سے لے کر گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء تک افغان اپنی سرزمین پر پڑوسی ممالک کی لڑائی لڑتے رہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد افغانستان میں ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کے نام پر جو جنگ جاری ہے، وہ بھی بنیادی طور پر غیر افغانوں یعنی القاعدہ اور امریکا کی جنگ ہے، جبکہ اس کے بعد حکومتوں کی تشکیل اور مستقبل کے نقشے کی ترتیب کی کشمکش کی ڈور بھی افغانستان کی سرحدوں کے باہر سے ہلائی جا رہی ہے۔

مختصر سیاسی تاریخ

۳۲۸ قبل مسیح میں جب افغانستان سلطنت پارس کا حصہ تھا، سکندر اعظم نے اپنی فوجوں سمیت یہاں قدم رکھا۔ موجودہ صوبۂ بلخ ان کا پہلا نشانہ تھا۔ وہ یہاں سے ہرات، ہرات سے بلوچستان، بلوچستان سے غزنی، غزنی سے غور بند، غور بند سے پنج شیر اور پنج شیر سے دریائے آمو عبور کرتا ہوا مرکندا (ثمرقند) تک جا پہنچا۔ سکندر اعظم کے بعد چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں ساسانی اور ترک افغانستان پر قابض ہو گئے، لیکن ان کا قبضہ زیادہ دیر باقی نہ رہا اور اسی صدی کے اواخر میں عرب اسلام کے پیغام کے ساتھ افغانستان میں داخل ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ افغان واحد قوم ہے جس نے بحیثیت قوم اسلام کو قبول کیا۔ دسویں صدی کے آخری عشرے (۹۹۸ء) میں ترکوں نے قابض ہو کر یہاں غزنوی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ محمود غزنوی نے اپنی سلطنت کا دائرہ بتیس سال کے عرصے میں جنوب مغربی ہندوستان اور پنجاب تک اور دوسری طرف جنوب میں ایران تک وسیع کر دیا۔ ۱۰۳۱ء میں یامین محمد کے انتقال کے بعد غزنوی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور ۱۲۱۹ء میں چنگیز خان کی آمد تک افغانستان مختلف ریاستوں میں بٹا رہا۔ چنگیز خان کی قیادت میں منگولوں نے ہرات، غزنی اور بلخ سمیت متعدد شہروں کو تاراج کیا۔ چودھویں صدی میں چنگیز خان کے انتقال کے بعد اس کے ایک جانشین تیمور لنگ نے افغانستان کو اپنا مستقر بنا کر ترکی سے ہندوستان تک پھیلی ہوئی اپنی سلطنت قائم کی۔ تیمور کے جانشینوں کا دور ۱۵۰۶ء تک رہا جس کے بعد افغانستان مغل اور صفوی حکومتوں میں تقسیم ہوا۔ ہندوستان پر مغل حکمرانی کے طویل دور کا بانی بابر، تیمور لنگ کی نسل سے تھا۔ اس نے کابل کو اپنا دار الحکومت بنا لیا۔ اٹھارویں صدی میں نادر شاہ نے افغانستان کے بیشتر علاقوں پر اپنا تسلط مضبوط کر کے مغلوں کو دہلی پر قبضہ برقرار رکھنے کی اجازت دے دی۔ نادر شاہ کے بعد افغانستان کے سیاسی افق پر احمد شاہ درانی نمودار ہوئے، جنھیں ۱۷۴۷ء میں افغان قبیلے کا سردار منتخب کر لیا گیا۔ انھیں جدید افغانستان کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ انھوں نے مشہد سے دریائے آمو تک اور ہرات سے لے کر پنجاب و کشمیر تک اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ احمد شاہ ابدالی کی وفات کے بعد قندھار کے مقامی پختونوں کے ساتھ تعلقات کی خرابی کی وجہ سے ان کے بیٹے نے کابل کو دار الحکومت بنایا۔ اگلے پانچ سالوں میں وہ کشمیر، سندھ، اور

خراسان وغیرہ کے علاقے کھو بیٹھا۔ برصغیر پر انگریز کے قبضے کے بعد، افغانستان روسیوں اور انگریزوں کی کشمکش کا مرکز بن گیا۔ وسط ایشیا کی طرف روس کے بڑھتے ہوئے قدم دیکھ کر انگریز بھی افغانستان میں قدم جمانے کے منصوبے بنانے لگے۔ افغانستان کو اپنے زیر اثر لانے کی خاطر انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ۱۸۰۹ء میں افغان حکمران شاہ شجاع کے ساتھ مشترکہ دفاع کے معاہدے پر دستخط کیے۔ روسی تسلط کے خطرے اور اپنے توسیعی عزائم کے پیش نظر ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے افغانستان پر حملہ کیا اور ابتدائی طور پر وہ غزنی، قندھار اور کابل سمیت بیشتر علاقوں پر قابض ہو گئے، لیکن آخری نتیجے کے طور پر انگریزوں کو ایسی عبرت ناک شکست ہوئی اور ان کی فوج اتنی بڑی تباہی سے دوچار ہوئی کہ یہ شکست آج تک نہ صرف انگریزوں کے لیے طعنہ بنی ہوئی ہے، بلکہ اسے افغانوں کی قوت مزاحمت کو ثابت کرنے کے لیے بطور مثال بھی پیش کیا جاتا ہے۔ ۱۸۷۲ء میں روس اور برطانیہ کے درمیان ہونے والے معاہدے میں دریائے آمو کو افغانستان کی شمالی سرحد تسلیم کر لیا گیا۔ افغان حکمران امیر شیر علی کی طرف سے کابل میں برطانوی مشن قائم کرنے کی اجازت نہ دینے کی بنا پر انگریزوں نے ۱۸۷۸ء میں ایک بار پھر افغانستان پر حملہ کیا۔ امیر شیر علی زار روس سے مدد لینے کے لیے روس روانہ ہوئے تاہم انھیں دریائے آمو سے مایوس لوٹنا پڑا اور واپسی پر بلخ میں انتقال کر گئے۔ امیر شیر علی شاہ کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا انگریز کے مقابلے کے قابل تھا نہ اپنی حکمرانی کو قائم رکھنے کے۔ چنانچہ شاہ کا بھتیجا عبدالرحمان جو ۱۲ سال سے ثمرقند میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا، دریائے آمو کے راستے افغانستان میں داخل ہوا اور انگریزوں کے تعاون سے امیر افغانستان قرار پایا۔ اس کے دور میں انگریز اور روسی افغانستان کی موجودہ سرحدوں کو تسلیم کرنے کے معاہدے پر متفق ہوئے۔ ۱۸۹۳ء میں امیر عبدالرحمان نے انگریزوں کے ساتھ ڈیورنڈ لائن کے معاہدے پر دستخط کیے جس کے نتیجے میں پختون دو حصوں میں بٹ گئے۔ ۱۹۰۱ء میں امیر عبدالرحمان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا حبیب اللہ خان تخت نشین ہوا۔ حبیب اللہ خان نے برطانیہ اور روس، دونوں کو افغانستان سے ایک فاصلے پر رکھنے کی کوشش کی اور اپنی غیر جانب داری ثابت کرنے کی خاطر جرمنی کی مسلسل پیشکش کے باوجود پہلی جنگ عظیم میں افغانستان کو ملوث نہیں ہونے دیا۔ حبیب اللہ خان ۱۹۱۹ء میں انگریز مخالف لوگوں کے ہاتھوں قتل ہوا جس کے بعد اس کا بیٹا امان اللہ خان حکمران بنا۔ جنگ عظیم کے نتیجے میں انگریزوں کے کمزور ہو جانے سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کر کے کسی حد تک دوسری افغان انگریز جنگ میں اپنی شکست کا بدلہ لے لیا۔ اگست ۱۹۱۹ء میں معاہدۂ راولپنڈی کے نتیجے میں انگریز افغانستان کی خارجہ پالیسی پر کنٹرول، جو انھوں نے دوسری افغان جنگ کے بعد حاصل کیا تھا، سے دستبردار ہو گئے۔ خارجہ پالیسی کی تشکیل میں آزادی مل جانے کے فوراً بعد امان اللہ خان نے اقوام عالم بالخصوص روس کے ساتھ تعلقات استوار کرنا شروع کیے اور ۱۹۲۱ء میں دونوں ملکوں کے مابین معاہدۂ دوستی پر دستخط ہوئے۔ امان اللہ خان کو ایک طرف روس سے خاطر خواہ فوجی اور مالی امداد ملی تو دوسری طرف انھوں نے افغانستان کو تیزی کے ساتھ جدیدیت کی راہ پر گامزن کیا جس کے خلاف انھیں قدامت پسند پختونوں کی مزاحمت کا سامنا تھا۔ یورپ سے واپسی پر جب انھوں نے مخلوط

تعلیمی نظام کے نفاذ کے علاوہ تیزی کے ساتھ جدیدیت کی طرف قدم اٹھانے شروع کیے تو ان کے خلاف بغاوت پھیلنے لگی۔ بغاوت کو کنٹرول نہ کرنے کی وجہ سے وہ ملک سے باہر چلا گئے اور باغیوں کا ایک رہنما بچہ ثقاوٴ افغانستان کا حکمران بن گیا۔ نو ماہ بعد امان اللہ کے ایک سابق کمانڈر محمد مالک خان نے بچہ ثقاوٴ کو حکومت سے علیحدہ کر دیا اور امان اللہ خان کے چچازاد بھائی نادر خان کی حکمرانی کی راہ ہموار کی۔ ۱۹۳۰ء میں لویہ جرگہ کے فیصلے کے نتیجے میں نادر خان کو بادشاہ مقرر کر دیا گیا۔ صرف تین سال بعد نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا اور ان کی جگہ ان کا انیس سالہ بیٹا ظاہر شاہ حکمران بنا۔ اگست ۴۷ء میں قیام پاکستان کے فوراً بعد قبائلی شورش کو دبانے کے لیے حکومت پاکستان کی کارروائی کو جواز بنا کر، افغان حکومت برطانوی ہند اور افغانستان کے درمیان سرحدوں کا تعین کرنے والے تمام معاہدوں سے منحرف ہوگئی۔ پختونستان کا مسئلہ کھڑا کر کے اس نے پاکستان کے اندر پختون قوم پرستوں کو سپورٹ کرنا شروع کر دیا۔ تعلقات میں پیدا ہونے والی اس کشیدگی کی وجہ سے حکومت پاکستان نے افغانستان کو پٹرولیم مصنوعات کے لیے دی جانے والی راہ داری کی سہولت ختم کر دی۔ چنانچہ کابل حکومت جولائی ۱۹۵۰ء میں متبادل کے طور پر سوویت یونین کے ساتھ تجارتی معاہدے پر مجبور ہوئی۔ وقت کے ساتھ دفاعی اور معاشی لحاظ سے افغانستان کا سوویت یونین پر انحصار بڑھنے لگا۔ ۱۹۶۴ء میں افغان آئین میں اصلاحات کر کے ظاہر شاہ نے اسے عملاً ایک سیکولر آئین میں بدل دیا۔ اس آئین کی رو سے ۱۹۶۵ء میں منتخب پارلیمنٹ اور صوبائی کونسل کے انتخابات ہوئے جن میں ایک تہائی حصہ بادشاہ کے نامزد کردہ افراد پر مشتمل تھا۔ ظاہر شاہ کے ہاتھوں افغانستان کے اندر جمہوریت کے اس تجربے نے بائیں بازو کی انتہا پسند جماعتوں کو حکومت میں دخیل ہونے اور جواب میں دائیں بازو کی جماعتوں کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کیا۔ ۱۹۶۷ء میں کمیونسٹ پارٹی یعنی پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ خلق کے نام سے بننے والے دھڑے کی قیادت نور محمد ترکئی اور پرچم دھڑے کی قیادت ببرک کارمل کے حصے میں آئی۔ خلق دھڑے کو افغان فوج کی سرپرستی حاصل تھی۔ ۱۹۷۳ء میں جب کہ شاہ ظاہر شاہ علاج کے لیے اٹلی گئے ہوئے تھے، ان کے سابق وزیر اعظم اور چچازاد بھائی سردار محمد داوٴد خان نے اقتدار پر قبضہ کر کے بادشاہت کے خاتمے کا اعلان کر کے افغانستان کو جمہوریہ قرار دیا اور خود اس کے صدر اور وزیر اعظم بن گئے۔ سوویت یونین کی کوششوں سے پی ڈی پی اے کے دونوں دھڑوں یعنی خلق اور پرچم کے اتحاد کے بعد ۲۸ اپریل ۱۹۷۸ء کو کمیونسٹوں نے حکومت پر قبضہ کر کے سردار داوٴد اور ان کے اہل خانہ کو قتل کیا۔ کمیونسٹوں کے برسر اقتدار آنے اور ان کی سوشلسٹ پالیسیوں کے جواب میں اسلامی ذہن رکھنے والی قوتیں بھی متحرک اور منظم ہونے لگیں۔ انقلاب مخالف افغان پاکستان، یورپ اور امریکا کا رخ کر کے اپنے آپ کو مزاحمت کے لیے تیار کرنے لگے۔ دوسری طرف کمیونسٹوں نے افغان عوام کے مزاج سے غیر موافق، غیر اسلامی اور آزاد خیال پالیسیوں کو اپنائے رکھا جن کی وجہ سے عوام کی صفوں سے بھی حکومت کے خلاف اور مجاہدین کے حق میں آوازیں اٹھنے لگیں۔ پی ڈی پی اے کی صورت میں اپنے ہم خیالوں کے اقتدار سے بھرپور فائدہ اٹھا کر سوویت یونین نے افغانستان کے اقتصادی، سیاسی اور فوجی معاملات میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ملوث کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ دسمبر ۷۸ء میں افغانستان اور سوویت یونین کے مابین ایک اور معاہدہ طے پایا جس میں قرار پایا کہ کابل حکومت بوقت ضرورت ماسکو سے فوج بلا سکتی ہے۔ ستمبر ۱۹۷۹ء میں وزیراعظم اور وزیر دفاع حفیظ اللہ امین نے نور محمد ترکئی کو قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ حفیظ اللہ امین افغانستان پر اپنی گرفت کو مضبوط نہ کر سکے اور ان کی حکومت کے عدم استحکام کو بہانہ بنا کر کمیونسٹ حکومت کی بقا کے لیے، دسمبر ۱۹۷۹ء میں سوویت افواج افغانستان میں داخل ہوئیں۔ حفیظ اللہ امین کو قتل کر دیا گیا اور ان کی جگہ ماسکو میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے والے پرچم دھڑے کے سربراہ ببرک کارمل کو واپس بلا کر تخت کابل پر بٹھا دیا گیا۔ سوویت فوجوں کی آمد کے ساتھ پاکستان، امریکا، سوویت یونین مخالف بلاک اور عرب ممالک کے تعاون سے مجاہدین نے باقاعدہ مزاحمت کا آغاز کیا۔ لاکھوں لوگ پاکستان اور ایران کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے اور افغانستان میں تباہی و بربادی کی ایک طویل تاریخ رقم ہونے لگی۔ مجاہد تنظیموں کی قیادت سنبھالنے والے بیشتر رہنما (پروفیسر ربانی، احمد شاہ مسعود، گلبدین حکمت یار وغیرہ) سردار داؤد کے دور میں پاکستان آئے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے انھیں پشاور میں دفاتر کے قیام کی اجازت دے کر مکمل سرپرستی کا یقین دلایا تھا۔ سوویت افواج کی افغانستان آمد سے کچھ عرصہ قبل پاکستان میں جنرل محمد ضیاء الحق اقتدار پر قابض ہو چکے تھے۔ انھوں نے کمیونسٹوں کے خلاف اسلامی ذہن رکھنے والے مجاہدین کی مزاحمت کو پاکستان کے دفاع کی جنگ قرار دے کر، علانیہ طور پر اس کو سپورٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ پاکستان کے اندر امریکی تعاون سے مجاہدین کی تربیت کا سلسلہ زور پکڑ گیا۔ پاکستان کی مذہبی جماعتیں بالخصوص جماعت اسلامی بھی مجاہدین کی مدد کے لیے آگے بڑھیں۔ پاکستانی صدر ضیاء الحق نے افغانستان میں مجاہدین کی تحریک مزاحمت کو پاکستان کے دفاع کی جنگ قرار دیا تو امریکا کی زیر قیادت مغرب نے بھی افغانستان کو کمیونزم کے راستے میں آخری بند کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ مغربی میڈیا افغان گوریلوں کو مجاہدین کا خطاب دے کر، ان کے حق میں پروپیگنڈا کرنے لگا۔ امریکا کی شہ پر مجاہدین کی مدد کے لیے عرب ممالک اور شیوخ بھی آگے بڑھے اور یہی وہ وقت تھا جب اسامہ بن لادن اور ان جیسے دیگر عرب مجاہدین افغان جہاد میں شرکت کی غرض سے پشاور چلے آئے۔ دوسری طرف سوویت یونین نے اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے اپنے تمام وسائل افغانستان میں جھونک دیے۔ افغان تحریک مزاحمت جو شروع میں پروفیسر برہان الدین ربانی کی زیر قیادت ایک جمعیت اسلامی کی صورت میں شروع ہوئی، وقت کے ساتھ ساتھ مختلف گروہوں میں تقسیم ہوتی رہی۔ شخصی اختلافات کی وجہ سے یا پھر زیادہ سے زیادہ بیرونی امداد کے حصول کی خاطر مجاہد لیڈر ایک دوسرے سے الگ ہو کر، الگ تنظیمیں قائم کرتے رہے۔ ''جمعیت اسلامی'' جو ۱۹۷۲ء میں قائم ہوئی تھی، سے پہلا دھڑا گلبدین حکمت یار کی زیر قیادت ۱۹۷۹ء میں الگ ہوا اور انھوں نے ''حزب اسلامی'' کے نام سے ایک الگ تنظیم قائم کر لی۔ مختصر عرصے میں اس تنظیم کو مجاہدین کی سب سے موثر اور بڑی تنظیم کی حیثیت حاصل ہو گئی جو نہ صرف پاکستانی اور امریکی امداد کی سب سے زیادہ مستحق قرار پائی، بلکہ اسی تنظیم نے سوویت فوجوں کے خلاف مزاحمت میں بھی سب سے موثر کردار ادا کیا۔ پکتیا سے تعلق رکھنے والے مولوی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یونس خالص نے بھی اسی سال ''حزب اسلامی'' (خالص) کے نام سے اپنی الگ تنظیم قائم کر لی۔ روانی سے عربی بولنے والے پروفیسر عبدالرب رسول سیاف ۱۹۸۰ء میں جیل سے رہائی کے بعد پاکستان آئے اور یہاں اتحاد اسلامی کے نام سے اپنی جماعت قائم کی۔ سعودی عرب کی طرف سے بھرپور مالی امداد ملنے کی وجہ سے اس تنظیم نے مختصر عرصے میں موثر جہادی تنظیم کی حیثیت حاصل کر لی۔ جنوبی افغانستان کے صوفی سلسلۂ نقشبندی کے رہنما پیر صبغت اللہ مجددی نے ۱۹۸۰ء میں جبہ نجات ملی (دی افغانستان نیشنل لبریشن فرنٹ) کے نام سے اپنی الگ تنظیم قائم کی۔ جہادی میدان میں یہ تنظیم کوئی قابل ذکر کردار ادا نہ کر سکی، تاہم عوامی سطح پر اسے بڑی حد تک سپورٹ حاصل رہی۔ جنوبی افغانستان ہی سے تعلق رکھنے والے مولوی محمد نبی محمدی نے بھی ۱۹۸۰ء میں ''حرکت انقلاب اسلامی'' کے نام سے اپنی الگ تنظیم قائم کر لی۔ اس تنظیم میں زیادہ تر علما اور ائمۂ مساجد شامل تھے۔ اس تنظیم نے بھی جہادی میدان میں کوئی موثر کردار ادا نہیں کیا، تاہم قندھار، ہلمند، اور پکتیا جیسے علاقوں میں اسے خاطر خواہ عوامی حمایت حاصل رہی۔ طالبان تحریک کے زیادہ تر رہنما بھی اسی تنظیم سے وابستہ رہے تھے۔ پیر سید احمد گیلانی، جن کے خاندان کو موروثی روحانی رتبے کا حامل قرار دیا جاتا ہے، نے بھی ''محاذ ملی افغانستان'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی۔ ان کی تنظیم سابق شاہ ظاہر شاہ کی حامی تصور کی جاتی ہے اور وہ کمیونسٹوں کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ظاہر شاہ کی واپسی کے لیے سرگرم عمل رہی۔ مزار شریف سے تعلق رکھنے والے شیعہ رہنما عبدالعلی مزاری نے ''حزب وحدت'' کے نام سے شیعہ کمیونٹی کی تنظیم قائم کی تھی۔ جہاد کے دنوں میں اسے ایران کی بھرپور سپورٹ حاصل رہی۔ بعد ازاں یہ تنظیم دو حصوں یعنی حزب وحدت (خلیلی گروپ) اور حزب وحدت (کریمی گروپ) میں بٹ گئی۔ اسی طرح ایک اور شیعہ رہنما آصف محسنی نے حرکت اسلامی کے نام سے اپنی الگ تنظیم قائم کی تھی اور آخری وقت تک یہ تنظیم بھی تحریک مزاحمت کا حصہ رہی۔ حکومت پاکستان کی کوششوں سے ۱۹۸۵ء میں سات مجاہد تنظیموں کا اتحاد عمل میں لایا گیا، لیکن یہ اتحاد بھی مجاہد تنظیموں کے اختلافات اور باہمی رقابتوں کو ختم نہ کر سکا۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ سوویت فوجوں کی موجودگی کے دنوں میں مجاہد تنظیمیں بیک وقت ایک ساتھ مل کر سوویت فوجوں کے خلاف لڑتی رہیں اور ساتھ ہی ساتھ گاہے بگاہے آپس میں بھی برسر پیکار رہیں۔ جب تک برزنیف سوویت یونین کا صدر رہا، افغانستان میں سوویت افواج کا انداز بھی بڑا جارحانہ تھا، تاہم اس دوران میں جہاں ایک طرف امریکا کی طرف سے سٹنگر میزائلوں کی فراہمی نے مجاہدین کی قوت مزاحمت کو راتوں رات کئی گنا بڑھا دیا، وہاں دوسری طرف کریملن میں برزنیف کی جگہ میخائل گورباچوف براجمان ہوا، جو شروع دن سے افغانستان سے اپنی فوجوں کی واپسی کی راہ ڈھونڈنے لگا۔ ۱۹۸۶ء میں ببرک کارمل کی جگہ ڈاکٹر نجیب اللہ افغانستان کے حکمران بنے۔ ماضی میں خاد تنظیم کے سربراہ رہنے کی وجہ سے اگرچہ ڈاکٹر نجیب اللہ ایک انتہا پسند کی شہرت رکھتے تھے، لیکن اقتدار سنبھالنے کے بعد سوویت یونین کے بدلتے تیور اور مجاہدین کی کامیابیاں دیکھ کر انھوں نے نسبتاً مصالحانہ پالیسی اختیار کی اور اپنی حکومت کی حمایت کو وسیع کرنے کے لیے مختلف قبائلی گروہوں کو راضی کرنے کی کوششوں میں مگن رہے۔ ۱۹۸۸ء میں پاکستان اور افغانستان کے مابین جینوا معاہدے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پر دستخط ہوئے، جس میں امریکا اور سوویت یونین نے بطور گارنٹر دستخط کیے۔ اس معاہدے کی رو سے سوویت یونین اور امریکا نے متحارب فریقوں کی مدد نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ مذکورہ معاہدے کی رو سے فروری ۱۹۸۹ء تک سوویت فوجیں افغانستان سے نکل گئیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت تک افغان جنگ میں چودہ ہزار پانچ سو سوویت فوجی اور دس لاکھ افغانی ہلاک ہوئے تھے۔ مجاہد تنظیمیں جینیوا معاہدے کی فریق تھیں نہ وہ اس معاہدے کو تسلیم کر رہی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے نجیب حکومت کے خلاف مزاحمت جاری رکھی اور سوویت فوجوں کے نکلنے کے بعد جنگ کا سلسلہ رکنے کے بجائے مزید تیز ہو گیا۔ پاکستان کے اس وقت کے سربراہ جنرل محمد ضیا الحق سیاسی تصفیے کے بجائے مجاہدین کو فاتح کے روپ میں کابل میں داخل کرانے کے خواہش مند تھے، چنانچہ آئی ایس آئی کے ذریعے سے انھوں نے نہ صرف مجاہدین کی سپورٹ جاری رکھی، بلکہ اس دوران میں مجاہدین نے افغانستان کے اہم شہروں پر قبضے کے لیے اپنی کوششیں بھی تیز کر دیں۔ دوسری طرف اپنی مصالحانہ پالیسیوں کی بدولت ڈاکٹر نجیب اللہ کابل، مزار شریف، ہرات اور جلال آباد جیسے شہروں پر وقت کے ساتھ ساتھ اپنے کنٹرول کو مزید مضبوط کرتے رہے۔ بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت کے اوائل میں جنرل حمید گل کی خواہش پر مجاہدین نے افغانستان کے مشرقی شہر جلال آباد پر بھرپور حملہ کیا۔ اس دوران میں ہونے والی لڑائی میں دونوں طرف سے ہزاروں لوگ ہلاک ہوئے۔ ابتدا میں مجاہدین ثمر خیل چھاؤنی کو عبور کر کے جلال آباد کے نواح میں پہنچ گئے تھے، لیکن بالآخر انھیں پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔ مجاہدین اور نجیب حکومت کی لڑائیوں کی یہ صورت حال مارچ ۱۹۹۲ء تک جاری رہی اور اسی سال شمال سے تعلق رکھنے والے ازبک جنرل رشید دوستم، جو کابل کے دفاع پر مامور تھے، کی بغاوت نے نجیب حکومت کے خاتمے کو ممکن بنا دیا۔ مجاہد کمانڈر احمد شاہ مسعود سے ساز باز کر کے رشید دوستم نے کابل شہر میں مجاہدین کے داخلے کی راہ ہموار کی۔ ڈاکٹر نجیب اللہ اقوام متحدہ کے دفتر میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ پاکستان کے اندر جماعت اسلامی اور مجاہدین کی حامی دیگر تنظیمیں فتح کے جشن منانے لگیں، لیکن درحقیقت مجاہدین کی یہ کامیابی ایک اور خون ریز دور کا آغاز ثابت ہوئی۔ کابل پر قبضے کے لیے شمال کی سمت سے احمد شاہ مسعود کی فوجیں داخل ہوئیں تو جنوب اور مشرق کی جانب سے گلبدین حکمت یار کے مجاہدین گھس آئے۔ کابل شہر کئی روز تک مجاہدین کی آپس کی لڑائیوں کا میدان بنا رہا۔ ۱۵ اپریل کو پاکستان کی بھرپور کوششوں کے بعد افغانستان کا انتظام چلانے کے لیے، پشاور میں مجاہد تنظیموں کے سربراہ ۵۱ رکنی عبوری جہاد کونسل کے قیام پر متفق ہو گئے۔ صبغت اللہ مجددی اس کونسل کے سربراہ بن کر کابل کے بے اختیار اور عارضی حکمران بن گئے۔ معاہدۂ پشاور کی رو سے جون ۱۹۹۲ء میں صبغت اللہ مجددی نے اقتدار پروفیسر ربانی کی زیر قیادت دس رکنی سپریم کونسل کے حوالے کیا۔ اسی ماہ کابل کے نواح میں پروفیسر سیاف کی اتحاد اسلامی اور شیعہ حزب وحدت میں لڑائی چھڑ گئی جس میں نہ صرف سیکڑوں لوگ ہلاک ہوئے، بلکہ خواتین اور بچوں پر جو مظالم ڈھائے گئے، انھیں جان کر آدمیت شرم محسوس کرنے لگتی ہے۔ ان لڑائیوں کے نتیجے میں کابل شہر کا مغربی حصہ کھنڈر بن گیا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۹۲ء کو برہان الدین ربانی نے تقریباً چودہ سو عمائدین کا جرگہ طلب کر کے اس کے ذریعے سے اپنے آپ کو مزید دو سال تک

کے لیے صدر منتخب کرایا۔گلبدین حکمت یار سمیت متعدد دیگر جہادی رہنماؤں نے جرگے کا بائیکاٹ کیا تھا اور اگلے دو سال کے لیے ربانی کے صدر بننے کا فیصلہ ہوتے ہی حکمت یار نے کابل کے قریبی پہاڑوں پر مورچے سنبھالنے شروع کیے۔ جنوری ۱۹۹۳ء میں کابل کے جنوب میں گلبدین حکمت یار اور ربانی کے وزیر دفاع احمد شاہ مسعود کی فوجوں میں شدید لڑائی کا آغاز ہوا۔ دو ماہ تک جاری رہنے والی اس لڑائی میں سیکڑوں افغان قتل ہوئے اور نتیجتاً کابل شہر کا جنوبی حصہ ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ مارچ ۱۹۹۳ء میں پاکستان کی کوششوں سے مجاہد تنظیموں کے مابین ایک اور معاہدہ عمل میں لایا گیا جس کی رو سے گلبدین حکمت یار وزیر اعظم اور پروفیسر ربانی صدر نامزد ہوئے۔ بدقسمتی سے اس معاہدے پر بھی عمل درآمد نہ ہوسکا۔گلبدین حکمت یار ایک روز کے لیے بھی کابل میں داخل نہیں ہوئے، جبکہ چند روز بعد انھوں نے اپنے نامزد وزیر دفاع استاد فرید کو کابل سے نکال دیا اور ایک بار پھر حکمت یار اور ربانی کے حامیوں میں شدید لڑائیوں کا آغاز ہوا۔اس جنگ میں شیعہ حزب وحدت گلبدین حکمت یار کا ساتھ دے رہی تھی جبکہ استاد سیاف اور رشید دوستم ربانی کے ساتھ کھڑے تھے۔حکمت یار نے اس دوران میں کابل کے جنوب مشرق میں واقع چہار سیاب کی پہاڑیوں کو اپنا ٹھکانہ بنا رکھا تھا اور وقتاً فوقتاً وہ کابل شہر کی طرف میزائل فائر کرتے رہے۔ یکم جنوری ۱۹۹۴ کو رشید دوستم، پروفیسر ربانی اور احمد شاہ مسعود سے ناراض ہو کر حکمت یار سے آن ملے۔ان کی فوجیں نہ صرف کابل شہر کے اندر احمد شاہ مسعود کی فوجوں سے الجھ گئیں، بلکہ شمالی صوبوں میں بھی دونوں کے حامیوں میں شدید جنگوں کا آغاز ہوا۔ان لڑائیوں میں ہزاروں افغان لقمۂ اجل بن گئے۔ برہان الدین ربانی اور حکمت یار کے مابین یہ صورت حال تقریباً طالبان کی آمد تک برقرار رہی۔جنوبی افغانستان کے بیشتر علاقوں پر طالبان کے کنٹرول سے حکمت یار اور ربانی دونوں بیک وقت ایک نئے خطرے سے دوچار ہوئے اور شاید اس مشترکہ خطرے کا نتیجہ تھا کہ کابل پر طالبان کے قبضے سے چند ماہ قبل قاضی حسین احمد کی کوششوں سے دونوں رہنماؤں کے مابین معاہدہ طے پایا اور گلبدین حکمت یار وزیر اعظم کی حیثیت سے کابل میں داخل ہو گئے، تاہم ایک مختصر عرصے کے بعد انھیں ربانی اور مسعود سمیت طالبان کے ہاتھوں کابل سے نکلنا پڑا۔

۱۹۹۲ء سے لے کر ۱۹۹۶ء تک اگر کابل شہر پر قبضے کے لیے حکمت یار اور ربانی کی کشمکش جاری رہی تو باقی ماندہ افغانستان بھی شہر ناپرساں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ربانی حکومت عملاً کابل اور احمد شاہ مسعود کے ماتحت کاپیسا اور بدخشاں صوبوں تک محدود رہی۔ نجیب حکومت کے خاتمے کے بعد الگ الگ کمانڈروں نے مختلف صوبوں کا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔مرکزی نظام کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہر صوبے پر قابض کمانڈر اپنی طرز کی حکومت چلا رہا تھا۔مشرقی صوبوں یعنی ننگرہار، کونڑ اور لغمان کا انتظام حاجی عبدالقدیر کی زیر قیادت مشرقی شوریٰ کے پاس تھا جس میں مختلف کمانڈر شامل رہے۔ان کمانڈروں نے جگہ جگہ پھاٹک بنا رکھے تھے اور گزرنے والے لوگوں سے بھاری ٹیکس وصول کیے جاتے تھے۔منظم فوج اور پولیس کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان علاقوں میں امن وامان کی صورت حال انتہائی ابتر تھی۔ ایرانی سرحد سے متصل شہر ہرات پر ربانی کے حامی، مگر خود مختار کمانڈر اسماعیل خان نے قبضہ کر رکھا تھا۔انھوں نے ہرات کے مشرق میں فراہ، شمال میں غور اور مغرب میں بادغیس کے

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

صوبوں تک اپنے دائرۂ اختیار کو وسیع کر رکھا تھا۔ بلخ صوبے پر ازبک جنرل رشید دوستم کا قبضہ تھا اور انھوں نے بھی نواحی صوبوں جوز جان اور فاریاب تک اپنی حکومت کو وسعت دے رکھی تھی۔ وسطی افغانستان یعنی بامیان وغیرہ شیعوں کے ماتحت تھے۔ اس سے متصل کچھ علاقے اسماعیلی فرقے کے اسماعیل نادرے کے قبضے میں تھے۔ قندھار کا کنٹرول گل آغا اور اسی نوع کے دیگر کمانڈروں نے سنبھال رکھا تھا۔ الغرض پورا ملک انارکی کی کیفیت کا شکار تھا اور ہر جگہ کمانڈروں نے الگ الگ حکومتیں قائم کر رکھی تھیں جو کسی مرکزی اتھارٹی کے پابند نہیں تھے۔ صوبوں کے حوالے سے مرکز کی بے اختیاری کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک طرف ہرات کے گورنر اسماعیل خان ایران کے ساتھ اقتصادی معاہدے کر رہے تھے تو دوسری طرف ننگر ہار کے گورنر حاجی قدیر نے براہ راست دوبئ سے تجارتی پروازوں کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ بنیادی طور پر یہی انارکی تھی جس نے طالبان جیسی قوت کے عروج کی راہ ہموار کی۔

[باقی]

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہمارا اخلاقی وجود اور اس کی اہمیت

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اپنے ساتھ کسی قسم کا اخلاقی وجود لے کر نہیں آتا۔ اس کے اخلاقی وجود کی تشکیل ان افعال و اعمال سے ہوتی ہے جن کا ظہور دنیا میں آنے کے بعد اس کی ذات سے ہوتا ہے۔ چنانچہ اخلاقی وجود پر کسی قسم کی گفتگو کرنے سے پہلے یہ بہتر ہو گا کہ ہم اس کی تشکیل میں کارفرما عوامل کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان اسباب و محرکات کو معلوم کریں جو انسانی افعال و اعمال کے پس پشت کام کرتے ہیں۔ ان بنیادوں کو متعین کریں جن کے اوپر وہ اپنی عملی زندگی کے گھروندے کی تعمیر کرتا ہے۔ انسانی عمل کے یہ محرکات مندرجہ ذیل ہیں۔

انسان کے عمل کا پہلا اور سب سے قوی محرک ضرورت ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان کے ساتھ کچھ لازمی ضروریات لگی ہوئی ہیں جن کو پورا کیے بغیر وہ جی نہیں سکتا۔ انسان کو بھوک لگتی ہے۔ وہ پیاس محسوس کرتا ہے۔ اسے ایک چھت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اپنے وجود کے تسلسل کے لیے وہ اولاد کا محتاج ہے۔ یہ اور اس جیسی دیگر کئی ضروریات ہیں جن کی عدم تکمیل اس کی بقا کو خطرے میں ڈال دیتی ہے۔ چنانچہ انسان ان کی تکمیل کے لیے تگ و دو شروع کر دیتا ہے۔ اور اسی تگ و دو سے حیات انسانی کا سب سے ضخیم باب تشکیل پاتا ہے۔ بھوک کو ہی لے لیجیے۔ زمانہ قبل از تاریخ میں شکار کے پیچھے بھاگنے سے لے کر آج دفتروں میں بیٹھ کر فائلوں کی ورق گردانی کرنے تک انسان نے جو کچھ کیا ہے، اس کے پیچھے یہی ضرورت کارفرما رہی ہے جس کی تسکین اس کے وجود کی بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ بلکہ کارل مارکس نے تو معاش کو بنیاد بنا کر انسانی تاریخ کو متعین کرنے کی کوشش تک کر ڈالی ہے۔

انسان کی سعی و کاوش کا یہ سلسلہ ضروریات کی تکمیل پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان میں خواہشات کا ایک ایسا تلاطم بھی برپا رہتا ہے جو اسے خوب سے خوب تر کی جستجو پر مجبور رکھتا ہے۔ وہ صرف اپنی ضرورت پوری ہونے پر ہی قانع نہیں رہتا، بلکہ خواہش کرتا ہے کہ بہتر سے بہتر طریقے پر اسے اپنی مراد حاصل ہو۔ یہی خواہشات کی وہ زنجیر ہے جو اس حیوان ناطق کو کشاں کشاں جھونپڑی سے محل اور گھر کے سکون سے تخت شاہی کے ہنگاموں تک ہنکاتی ہوئی لے جاتی ہے اور

دال سبزی سے پیٹ کی آگ بجھانے والا انسان لذت کام ودہن کا ایک ایسا خوان نعمت سجا تا ہے جس کی وسعت سات سمندر سے زیادہ ہے۔

ضروریات وخواہشات کے یہ محرکات اس کے میدان عمل کی حد بندی کا آخری نشان نہیں، بلکہ جذبات واحساسات کی رنگین اور جادوئی دنیا بھی انسان کی توانائیوں کو دعوت عمل دیتی ہے۔ انسان کو غصہ آتا ہے۔ بالکل ایسے ہی اسے پیار بھی آتا ہے۔ وہ عہد ووفا کی پاس داری کرتا ہے اور دوستی اور محبت کے تقاضوں کو بھی نبھاتا ہے۔ وہ بغض وحسد کی آگ میں جلتا ہے اور نفرت وعداوت کے صحرا میں بھی جھلستا ہے۔ وہ عقیدت کی شمع جلاتا ہے اور اطاعت کے پھول بھی نچھاور کرتا ہے۔ وہ سرکشی کا لاوہ اگلتا ہے اور بغاوت کی آندھی بھی اٹھاتا ہے۔ اور یوں بھی ہوتا ہے کہ اس کے جذبات اسے اس مقام پر لے آتے ہیں جہاں وہ اپنی جان دے دیتا ہے اور دوسروں کی جان لے بھی لیتا ہے۔

اصولی طور پر انسانی عمل کو مہمیز لگانے والے عناصر کی کہانی یہیں ختم ہو جانی چاہیے، مگر انسانی جذبوں میں ہی ایک جذبہ ایسا بھی ہے جو اپنی اہمیت، انسانی شخصیت میں اپنی گہری اساسات اور عملی زندگی میں اپنے اثرات اور نتائج کے اعتبار سے بالکل منفرد حیثیت کا حامل ہے اور اس بات کا مستحق ہے کہ اس کا ذکر الگ کیا جائے۔ یہ جذبۂ شہوت یا جنس کا جذبہ ہے۔ جنس کا جذبہ انسانی اعمال اور رویوں پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے، اگر اسے دیکھنا ہے تو مثال کے طور پر کسی مخلوط تعلیمی ادارے میں چلے جائیے۔ یہی جذبہ اشتہار کی صنعت میں خواتین کے بے جا استعمال کی واحد توجیہ ہے۔ انسان آج ہی ایسا نہیں ہوا۔ انسان کی مجموعی تاریخ میں اس کے اثرات دیکھنے ہوں تو ادب اور آرٹ کی تاریخ ملاحظہ کر لیجیے۔ فنون لطیفہ کی داستان پڑھ لیجیے۔ مصوری ومجسمہ سازی، شعروشاعری، فلم وموسیقی غرض کسی بھی شعبے میں ہونے والے کام کو دیکھ لیجیے۔ آپ جان لیں گے کہ انسان کے اعصاب پر کس طرح یہ جذبہ سوار رہا ہے۔ فرائڈ نے جو کچھ کہا اس سے کلی اتفاق تو نہیں کیا جا سکتا، مگر اس کی کلی تردید بھی ممکن نہیں۔

ضروریات، خواہشات، جذبات اور شہوات کے یہ چار بنیادی محرکات ہیں جو انسانی عمل کی اساس ہیں اور جن کی بنیاد پر انسان اپنی دنیا آباد کرتا ہے۔ تاہم اس مرحلے پر ایک اور اہم سوال کا جواب دینا ضروری ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ خود یہ محرکات کہاں سے آتے ہیں؟ ان کا منبع اور سرچشمہ کہاں ہے؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیں اور ان عناصر کو دریافت کریں جن سے مل کر ایک انسانی وجود تشکیل پاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم قرآن مجید سے مدد لیتے ہیں۔ سورۂ سجدہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے عمل کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

> ''وہی ہے جس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی اور انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی۔ پھر اس کی نسل کو حقیر پانی کے ست سے چلایا۔ پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی اور تمھارے کان، آنکھ اور دل بنائے۔ تم کم ہی شکر کرتے ہو۔'' (۳۲: ۷۔۹)

یہ اور اس موضوع سے متعلق دیگر آیات بتاتی ہیں کہ انسانی وجود کی تخلیق میں تین عناصر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک اس کا حیوانی وجود، دوسرا روحانی اور تیسرا اس کا عقلی وجود۔ اس کا حیوانی وجود دیگر جان داروں کی طرح مادی عناصر کی آمیزش سے تشکیل پاتا ہے۔ تمام حیوانی جبلتیں اور نظام اس کے وجود کا اسی طرح حصہ ہیں جس طرح دوسرے حیوانات کا حصہ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تخلیق آدم سے لے کر آج تک ہر انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کا کل سرمایہ صرف ایک حیوانی وجود نہیں ہوتا، بلکہ وہ خدا کی طرف سے پھونکی گئی ایک اور شے بھی لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ اس پھونک کی حقیقت کو تو ہم متعین نہیں کر سکتے، البتہ یہ بات ہم جانتے ہیں کہ اس پھونک کے باعث انسان اپنے اندر ایک روحانی شعور اور شخصیت محسوس کرتا ہے جس کا ادراک حیوانی جسم رکھنے والا کوئی دوسرا جانور نہیں کر سکتا۔ حیوانی اور روحانی وجود، دونوں مل کر انسان کی بنیادی شخصیت کی صورت گری کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ جو تیسری چیز انسان کو عطا کی گئی ہے، وہ سوچنے سمجھنے، غور و فکر اور عقل و بصیرت کی وہ استعداد ہے، جسے قرآن اکثر کان، آنکھ اور دل کے اسلوب سے تعبیر کرتا ہے۔ یہی انسان کا عقلی وجود ہے۔

انسانی شخصیت انھی تین رنگوں سے مرکب ہے۔ اور اس دنیا میں جب کبھی وہ اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے تو انھی تین پہلوؤں میں سے کسی ایک یا ان تینوں کے مجموعے کا کوئی عکس صفحۂ ہستی پر نمودار ہوتا ہے۔ انسان کی شخصیت کے یہی پہلو ہیں جن سے وہ محرکات پھوٹتے ہیں جن کا کچھ تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں۔ چنانچہ بھوک اس لیے ہے کہ انسان کے حیوانی وجود کا یہ تقاضا ہے۔ اسے اپنی بقا کے لیے خوراک چاہیے۔ پھر انسان اس کے لیے معاش کی جدوجہد کرتا ہے۔ اس کا روحانی وجود مادی تقاضوں سے بلند ہو کر کچھ دوسری حقیقتوں کا متلاشی رہتا ہے۔ یہ تلاش اس کے روحانی وجود کا لازمی تقاضا ہے۔ جس کے نتیجے میں مذہبیت کا پورا کارخانہ وجود میں آتا ہے۔ انسان کو قلب و نظر دیے گئے ہیں جن کی مدد سے وہ چیزوں پر غور و فکر کرتا ہے۔ ان کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے۔ چنانچہ علم، فکر اور فن کی دنیا وجود پاتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی ہم دیکھتے ہیں، وہ اصلاً انسان کی اس سہ جہتی شخصیت کے اثرات ہیں جو زمین کے ہر اس خطے پر نقش ہیں جہاں اس کا قدم پہنچا۔

انسان کی تخلیق کردہ یہی سہ رنگی دنیا جو مذکورہ بالا محرکات کی چار دیواری میں قائم ہے، انسان کے اخلاقی وجود کی دنیا ہے۔ یہی وہ دنیا ہے جہاں انسان اپنا اظہار کرتا ہے اور یہی وہ دنیا ہے جس کی نوعیت کل قیامت کے دن یہ فیصلہ کرے گی کہ یہ انسان خدا کی رحمت کا مستحق ہے یا غضب کا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی حیوانی، روحانی اور عقلی شخصیت کو اپنے ہاتھوں سے وجود دینے کے بعد رب کائنات کیا اس کی اخلاقی دنیا سے بالکل بے نیاز ہو گیا ہے؟ حالانکہ یہی وہ دنیا ہے جہاں وہ انسان کا امتحان لیتا ہے۔ کیا اس معاملے میں انسان کو کوئی رہنمائی دی گئی ہے جس کی بنیاد پر انسان کا امتحان ہو گا یا اسے ضروریات، خواہشات، جذبات اور شہوات کے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اندھے کنوئیں میں بالکل تنہا چھوڑ دیا گیا ہے؟ کیا حیوانی اور روحانی وجود میں توازن کی کوئی راہ نہیں دکھائی گئی ہے؟ کیا انسان کے قواے عقلیہ کو کوئی رہنما اصول نہیں دیے گئے ہیں؟ کیا انسان کو بے آسرا کر کے اس کے ماحول کے حوالے کر دیا گیا ہے؟ کیا اس کی باگ وراثت کے ہاتھ میں چھوڑ دی گئی ہے کہ جہاں چاہے بگٹٹ اسے دوڑاتی پھرے؟ کیا انسان کو معلوم ہے کہ اس کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا؟ کیا نیکی ہے اور کیا بدی؟ کیا خیر ہے اور کیا شر؟ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے؟

قرآن اس سوال کا جواب بڑے واضح انداز میں یہ دیتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کو بھیجتے وقت جس طرح اسے ایک مکمل حیوانی اور روحانی وجود دیا گیا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں زادراہ کے طور پر اس کے ہم رکاب کی گئی ہیں، اسی طرح انسان اس دنیا میں خیر وشر کے مکمل شعور کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔ وہ اس مادی دنیا میں اجنبی ضرور ہوتا ہے، مگر اخلاقیات کی دنیا کا کوئی گلی کوچہ اس کے لیے اجنبی نہیں ہوتا۔ یہ شعور اس درجہ کا ہوتا ہے کہ کسی پیغمبر کی رہنمائی نہ ہو تب بھی اسی کی بنیاد پر قیامت کے دن انسان کی فلاح یا ہلاکت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے:

''قسم ہے نفس انسانی کی اور جیسا کہ اسے ٹھیک بنایا۔ پھر اس کی بدی اور تقویٰ اسے الہام کیا، کامیاب ہوا وہ جس نے اس نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا جس نے اسے گھٹیا بنایا۔'' (سورۂ شمس ۹۱: ۷۔۱۰)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اسی طرح سورۂ بلد (۹۰) کی آیت ۱۰ میں باصراحت کہا گیا ہے کہ ہم نے انسان کو (خیر وشر) دونوں راہیں دکھا دیں۔ انسانی فطرت میں یہ احساسات اتنی واضح اور راسخ ہیں کہ انسانی تاریخ میں کبھی یہ حادثہ نہیں ہوا کہ خیر شر بن گیا اور شر خیر قرار پایا ہو۔ انسان انفرادی طور پر فطرت کی اس پکار پر کان دھرے نہ دھرے، لیکن انسانیت کے اجتماعی ضمیر نے افراد کے عملی انحراف کو کبھی معیار نہیں بنایا۔ جھوٹ اور سچ میں سے کون سی راہ درست ہے، مرد کے لیے انتخاب ایک عورت ہے یا ایک دوسرا مرد، انسانی جان کا احترام لازمی ہے یا نہیں، کمزور اور ضعیف رحم کے مستحق ہیں یا نہیں، بول براز کی نجاست اور درندوں کا گوشت وغیرہ دسترخوان پر سجانے کی چیزیں ہیں یا نہیں؟ یہ اور ان جیسے کتنے ہی امور ہیں جن میں انسان عملی طور پر ٹھوکر کھا جاتا ہے، مگر وہ یہ نہ جان سکے کہ کیا راستہ درست ہے اور کیا غلط ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ یہ بہرحال ہوا ہے کہ وقتی طور پر بعض معاشروں میں انسانی فطرت مسخ ہوئی اور فطرت سے انحراف معاشرے کا عرف بن گیا، مگر جیسا کہ ہم آگے چل کر دکھائیں گے کہ خدا نے فوراً مداخلت کی اور ایسی قوموں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور پوری انسانیت فطرت کی پگ ڈنڈی پر پہلے کی طرح چلتی رہی۔ اور آج کے دن تک ان قوموں کے رویے کو بگاڑ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

چنانچہ یہ بات بالکل واضح رہنی چاہیے کہ خیر وشر انسانی فطرت کے وہ بدیہیات ہیں جن کے تعین میں انسان کبھی ٹھوکر نہیں کھاتا۔ حتیٰ کہ ہم وحی کی جس ہدایت سے واقف ہیں، اس کی اپنی اساس یہی دین فطرت ہے۔ نبی اور رسول بھی جب آتے ہیں تو اپنی دعوت کی اساس اسی کو بناتے ہیں۔ وہ خود بھی اسی اساس پر کھڑے ہوتے ہیں۔ نبی ہونے کی کوئی علمی شرط ہمارے علم میں نہیں، لیکن ہم یہ بات باوثوق طریقے سے جانتے ہیں کہ وہ نخل فطرت کا اعلیٰ ترین ثمر ہوتے ہیں۔ ان کے دشمن بھی ان

کی اخلاقی حیثیت کو چیلنج نہیں کر سکتے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ جب میں بندوں کے معاملے میں جھوٹ نہیں بولتا تو خدا کے معاملے میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟ میں جب انسانوں کے معاملے میں امین ہوں تو خدا کے معاملے میں خیانت کیوں کروں گا؟ وہ جب دعوت حق پیش کرتے ہیں تو انسانی فطرت کے ان بدیہیات کو اپنی دعوت کی اساس بناتے ہیں۔ وہ ایمان و اخلاق کی درستی سے آغاز کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کو اسی کی یاددہانی کراتے ہیں۔ اس معاملے میں اگر کوئی انحراف ہوتا ہے تو اس کو درست کرتے ہیں، کوئی اختلاف ہوتا ہے تو اسے دور کرتے ہیں، کوئی چیز کم ہو جاتی ہے تو اسے بحال کرتے ہیں اور کچھ زیادتی ہو تو اسے حرف غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی شریعت پیش کرتے ہیں، وہ اس کے بعد آتی ہے۔ آپ دیکھ لیں کہ قرآن جب نازل ہوا تو ابتدا میں کون سی سورتیں نازل ہوئیں۔ ان تمام سورتوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً ان میں فطرت میں موجود اخلاق و ایمان کے تصور کو دعوت کی بنیاد بنایا گیا ہے۔

یہاں دو باتوں کی وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اول یہ کہ دین فطرت سے جو کچھ رہنمائی انسان کو ملتی ہے، تمام مسلمہ اخلاقی اقدار اس میں شامل تو ہیں، لیکن اخلاقیات کے علاوہ بھی دین فطرت سے انسانوں کو بہت کچھ رہنمائی ملتی ہے۔ مگر وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس لیے ہم ان کی تفصیل میں نہیں جا رہے۔ دوسرے یہ کہ ایمانیات میں سے توحید اصلاً اسی اخلاقی رہنمائی کا حصہ ہے جو ہمیں دین فطرت سے ملتی ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں اخلاقیات کا تذکرہ ہے، اس کے ساتھ اکثر توحید کا ذکر ملتا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیات ۲۲ تا ۳۹ ہیں۔ اس کے علاوہ البقرہ (۲) کی آیت ۸۳ اور النساء (۴) کی آیت ۳۶ اور قرآن کے کئی دیگر مقامات بھی اس حوالے سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ان آیات میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ توحید اخلاقیات کا رکن اول ہے۔ یہ تمام خیر کا سرچشمہ اور دوسری اخلاقیات کی طرح فطرت انسانی میں پیوست علم ہے۔ سورۂ اعراف (۷) کی آیات ۱۷۲۔۱۷۴ میں عہد الست کے حوالے سے باصراحت اس بات کا ذکر ہے کہ توحید کا علم انسانیت کے لیے اجنبی چیز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے وجود کے بارے میں کبھی انسانیت کو کوئی مسئلہ نہیں ہوا اور نہ ہی خدا اپنے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ البتہ چونکہ شیطان کو آزادی ہے کہ وہ لوگوں کو بہکائے، اس لیے وہ انھیں شرک کے بگاڑ میں مبتلا کرتا رہا ہے۔ اور انبیاے اکرام اسی بگاڑ کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسان کا اخلاقی وجود محض علمی نوعیت کی کوئی چیز نہیں جس پر فلسفیانہ انداز میں بحث و تمحیص کے بعد یہ معاملہ ختم ہو جائے۔ یہ وہ پرچۂ امتحان ہے جس کی بنیاد پر کل خداوند دو عالم انسانوں کے اعمال کو جانچے گا اور ان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔ اور جن قوموں میں نبیوں کی دعوت محفوظ نہیں رہی، وہاں تو نجات کی واحد کسوٹی یہی ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس پرچہ کے صحیح جوابات کی حفاظت کا اہتمام کیا جائے۔ جیسا کہ اوپر ہم نے بتایا ہے کہ اس سلسلے کا ایک بندوبست تو یہ کیا گیا ہے کہ انسانی فطرت خوشبو اور بدبو کی طرح خیر و شر کے امتیاز میں کبھی دھوکا نہیں کھاتی۔ دوسری طرف انبیا کے

ذریعے سے انسانی فطرت میں پیدا ہونے والے انحرافات کی بار بار تصحیح کی جاتی رہی ہے اور تیسری طرف جب کبھی شیاطین جن وانس کی دراندازی کے نتیجے میں کسی انسانی معاشرے میں فطرت کے معیارات ہی بدلنے لگے تو ایسی صورت میں اس پورے معاشرے کو ایک ناسور کی طرح انسانی وجود سے کاٹ کر پھینک دیا گیا۔ تاریخ انسانی میں یہ واقعہ اتنا معروف ہے کہ فلسفۂ تاریخ کے بانی ابن خلدون نے اس بات کو قوموں کے عروج وزوال کے ایک مسلمہ اصول کے طور پر بیان کیا ہے کہ اخلاق حمیدہ کے زوال کے ساتھ قوم کا زوال لازمی ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ جب کوئی قوم اخلاقی انحطاط کا شکار ہونے لگے تو اصلاح احوال کی کوشش کرنے والے ہر شخص کو اپنی ترجیحات میں اسے سب سے اوپر رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اس بات کا براہ راست تعلق قوم کی بقا سے ہوتا ہے۔ اخلاقی بحران کا شکار قوم اگر مسلمان ہے تو معاملہ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔ حامل کتاب ہونے کی بنا پر ان کے پاس اس انحراف کا کوئی عذر نہیں ہوتا۔ بنی اسرائیل اور مسلمان، دونوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب کبھی انھوں نے انحراف کی روش اختیار کی قدرت نے غیر معمولی مستعدی کے ساتھ ان کی سرزنش کی۔ بنی اسرائیل پر بخت نصر کی یورش سے لے کر مسلمانوں پر موجودہ مغربی غلبہ تک، ہر واقعہ گو عالم اسباب میں پیش آیا، مگر اس کی جڑیں اس اخلاقی انحطاط تک جاتی ہیں جس میں مبتلا ہونے کے بعد وہ حامل کتاب ہونے کی ذمہ داری ادا کرنے کے قابل نہیں رہے۔

آج بحیثیت ایک پاکستانی مسلمان کے ہمارے لیے کرنے کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اپنے اخلاقی وجود کی اہمیت کو محسوس کریں اور اخلاقی اقدار کو اپنی ذاتی زندگی اور معاشرے میں بحال کرنے کے لیے پوری قوت سے کوشش کریں۔ وہ اقدار جو دین فطرت اور دین وحی، دونوں کی بنیاد پر ہمیں ملی ہیں، مگر بدقسمتی سے ہم نے انھیں پس پشت ڈال دیا ہے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ڈر ہے کہ کہیں قدرت ہماری بھی سرزنش پر اسی طرح آمادہ نہ ہو جائے جو اس سے پہلے مسلمان قوموں کے ساتھ اس کا دستور رہا ہے۔

——— ریحان احمد یوسفی

تو پھر کیوں نہ......

ہمارے ہاں اکثر لوگ تمام غیر مسلموں کو کافر کہتے ہیں اور انھیں جہنمی قرار دیتے ہیں۔ اگر کسی جنگ یا لڑائی میں مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم مارے جائیں تو وہ بلا توقف کہہ دیتے ہیں کہ اتنے "......" جہنم واصل۔

پچھلے دنوں ایک رسالے میں تین ''کافروں'' اور ایک مسلمان حکمران کے بارے میں فیچر شائع ہوا۔ان میں دو مرد اور دو عورتیں شامل ہیں۔ رسالے کے مطابق ۱۱ستمبر ۲۰۰۱کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے سے ان لوگوں کی زندگی غیر معمولی طور پر متاثر ہوئی۔ہم نے یہ فیچر اس پہلو سے دیکھا کہ یہ چاروں افراد اپنی زندگی کے اہم معاملات کے لیے رہنمائی کہاں سے لیتے ہیں۔

اس فیچر میں ایک ''کافر'' نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ میں بہت زیادہ مذہبی آدمی نہیں ہوں، البتہ میں دو چیزوں کے حصول کے لیے دعا کرتا ہوں: ایک وہ بصیرت جو مجھے سیدھی راہ دکھائے اور دوسرے وہ جرأت جو مجھے اس راہ پر چلائے۔

دوسری ''کافرہ'' نے کہا کہ میں ہر رات دوزانو ہو کر دعائیں مانگتی ہوں۔ میں ہر وقت چھوٹی چھوٹی دعائیں کرتی رہتی ہوں۔میری دعائیں خصوصی نہیں، عمومی ہوتی ہیں۔میری ایک پسندیدہ دعا یہ ہے: (اے خدا،) میں تیرے پسندیدہ راستے پر چلوں، نہ کہ اپنے پسندیدہ راستے پر۔

تیسری ''کافرہ'' کا شوہر ۱۱ستمبر کو جنگل میں گر کر تباہ ہونے والے جہاز میں سوار تھا۔خبروں کے مطابق اس کے شوہر نے مسافروں کو اس بات پر ابھارا تھا کہ جہاز اغوا کرنے والوں کے ساتھ لڑا جائے۔ اسے یہ معلوم تھا کہ اس طرح اس سمیت سب مسافروں کی موت واقع ہو سکتی ہے، لیکن وہ اس عمارت میں موجود لوگوں کو بچانا چاہتا تھا، جہاں یہ جہاز ٹکرایا جانے والا تھا۔ چنانچہ جہاز میں لڑائی شروع ہوئی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جہاز اپنے ہدف تک پہنچنے سے پہلے ہی گر کر تباہ ہو گیا اور اس میں سوار تمام افراد جاں بحق ہو گئے۔

اس ''کافرہ'' کے تین بچے یتیم ہو گئے۔وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی۔اس کا والد بھی اس وقت فوت ہو گیا تھا جب وہ صرف ۱۵ سال کی تھی۔اس نے سخت اضطراب میں وہ حادثہ یہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا کہ خدا نے کسی حکمت کی خاطر ہی انھیں موت دی ہو گی۔اس نے کہا کہ والد کی موت نے مجھے اب یہ بات سمجھنے میں مدد دی ہے کہ میرے شوہر کی بے وقت موت کے پیچھے بھی خدا کی کوئی حکمت کارفرما ہو گی، جو خدا ہی کے علم میں ہے...... جو ابھی تک میرے اوپر واضح نہیں ہو سکی۔

اس فیچر میں مسلمان حکمران کے حوالے سے بتایا گیا کہ اس کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔اس پر ایک قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔اس سے پہلے بھی وہ موت کو بہت قریب سے دیکھ چکا ہے۔وہ نپولین اور نیکسن کی قائدانہ صلاحیتوں سے بہت متاثر ہے۔وہ نیکسن کی ایک کتاب کو بہت پسند کرتا ہے۔اپنے اس انٹرویو میں وہ نیکسن کے اقوال کا حوالہ بار بار دیتا ہے۔اس نے اپنی زندگی کے ایک بہت بڑے فیصلے کے بارے میں بات کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے یہ فیصلہ کرتے ہوئے نپولین کا ایک نقطۂ نظر سامنے رکھا تھا۔

ان ''کافروں'' کی دعائیں پڑھنے کے بعد ہمیں اللہ تعالیٰ کی سکھائی ہوئی بہترین دعا یاد آ گئی، وہ دعا جو سارے دین کی حامل ہے، وہ دعا جو صحیح دین داری کی غماز ہے، وہ دعا جو قرآن کا دیباچہ ہے، وہ دعا جو انسانی فطرت کی آواز ہے، وہ

دعا جو انسان کے عجز کا اقرار ہے، وہ دعا جو بندگی کا اظہار ہے، وہ دعا جو سب سے بڑی حقیقت کا اعتراف ہے۔ اور اس دعا کے الفاظ گواہی دیتے ہیں کہ انھیں ادا کرنے والا مذہبی جذبے سے سرشار ہے، وہ خدا کا سچا شکر گزار ہے اور وہ خدا کے سامنے کامل سپردگی کا طلب گار ہے:

سورۂ فاتحہ میں ہے:

اِھْدِ نَاالصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۔ (۱:۵-۶)	''ہم کو سیدھی راہ کی ہدایت بخش دے۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے عنایت فرمائی ہے۔''

یہ صراط مستقیم کیا ہے؟ صراط مستقیم پر چلنے والے کون لوگ ہیں؟

سورۂ نساء کی آیت ۶۹ سے بالکل واضح ہے کہ ان سے مراد انبیا و صدیقین اور شہدا و صالحین کی مقدس جماعت ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس مقدس جماعت کا تاریخی ریکارڈ کس کے پاس ہے؟

یہ ریکارڈ ہم مسلمانوں کے پاس ہے۔ جی ہاں، صرف ہم مسلمانوں کے پاس، جزئیات کی حد تک اور محفوظ ترین۔

لہٰذا ہمیں غور کرنا چاہیے کہ جب ''کافروں'' کے ہاں صراط مستقیم کی خواہش پائی جاتی ہے، جب ''کافروں'' کے ہاں رضاے الٰہی کی سعی پائی جاتی ہے، جب ''کافروں'' کے ہاں راضی برضا کی روش پائی جاتی ہے تو پھر کیوں نہ ہم انھیں نفرت سے دیکھنے کے بجائے، انھیں قتل کرنے کے بجائے، انھیں ''جہنم واصل'' کرنے کے بجائے دین کی تعلیم دیں، صحیح زندگی کا شعور دیں، انھیں جنتی بنائیں۔ جو یقیناً بہتر کام ہے، بلکہ بہترین کام ہے۔

ـــــ محمد بلال

بدلتی کیفیات

عقل نگاہ سے کام لے کر مشاہدہ کرتی ہے۔ اس مشاہدے کو ترتیب دے کر سلسلۂ خیالات بناتی ہے۔ موضوع و محمول، صغریٰ و کبریٰ اور فرع و اصل کے تانے بانے سے ایک نتیجے کو پا لیتی ہے۔ اگر نگاہ بیدار ہو، عقل حاضر ہو تو یہ سلسلہ اپنی کڑیاں مکمل کر کے صحیح نتیجے تک پہنچتا ہے اور اگر نگاہ کوتاہ ہو، عقل خفتہ ہو تو کیسی منطق اور کیسی رسائی؟ آدمی وہم و تردد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک بات سوچتا ہے اور اسے اس پر یقین نہیں ہوتا۔ دوسری بات سوچتا ہے تو بھی کسی نتیجے تک نہیں پہنچتا۔ اس بدلتی کیفیت کو انسان کی دوسری صلاحیتوں (Faculties) میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ دل کبھی نشاط سے لبریز ہوتا ہے اور کبھی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

پژمردہ۔جسم کسل مند ہوتا ہے اور چست بھی۔کان تیز ہوتے ہیں اور ثقیل بھی۔ یہ کمزوری اور فترت جو گاہے گاہے ہوتی ہے، عمر گزارنے کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔حتیٰ کہ ایک دانا و بینا انسان جو اپنے زمانۂ کمال میں کئی کارنامے دکھا چکا ہوتا ہے، زوال پزیر ہو جاتا ہے۔اس کی بینائی اور سماعت کام نہیں کرتیں، اعضا سست پڑ جاتے ہیں اور اس کی کارکردگی اور استعداد ماند پڑ جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں، اس کی ساخت ہی کو ہم الٹ دیتے ہیں۔کیا یہ حالت دیکھ کر بھی انھیں عقل نہیں آتی؟ اور تم میں سے کوئی ایسا ہوتا ہے جو ناکارہ عمر تک پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ جان لینے کے بعد کچھ نہ جانتا ہو۔

جسمانی عمر بڑھنے کے ساتھ اعضائے جسم کا زوال پزیر ہونا ہی اس دنیا کے فانی ہونے کی نشانی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ انسان بلوغت، عقل کی پختگی اور نت نئے تجربات حاصل کر لینے کے بعد کچھ عرصہ جی لیتا۔لیکن افسوس، اسے طرح طرح کے عوارض لاحق ہو جاتے ہیں۔عقل مضمحل ہو جاتی ہے۔قویٰ کمزور پڑ جاتے ہیں۔موت سامنے نظر آنے لگتی ہے اور وہ اگلے جہاں کو کوچ کر جاتا ہے۔

اسے دنیا کا بڑا المیہ کہا جا سکتا تھا، اگر دنیوی زندگی کے بعد حیات اخروی نہ ہوتی۔ وہ حیات، جہاں عارضوں اور نارسائیوں کا دخل نہ ہوگا۔کمزوریوں اور کوتاہیوں کو در آنے کی اجازت نہ ہوگی۔لیکن اس زندگی کو حاصل کرنے والے کون ہوں گے؟ وہ جنھوں نے اس زوال آمادہ زندگی میں کچھ کیا ہوگا۔دیے کی ٹمٹماہٹ اور ستاروں کی جھلملاہٹ کو غنیمت جان کر روشنی حاصل کی ہوگی۔

ضعف اور کسل مندی کے باوجود اس رنج دہ زندگی میں کچھ کر لینا چاہیے، کیونکہ بعد میں یہ موقع نہ مل پائے گا۔ یہ بدلتی کیفیات اور یہ اتار چڑھاؤ جاری رہیں گے۔اگر ہم نے تھوڑا سا عمل بھی کر لیا تو گویا اپنا حصہ وصول کر لیا۔ وہ حصہ جو ہمارا توشہ بنے گا۔اگر کم تر سطح پر جیے تو ہمیشہ کا زوال یقینی ہے اور اگر ذرا اوپر والی سطح پر رہنے کی کوشش کی تو کمال ملنے کا کافی امکان ہے۔

ـــــ ڈاکٹر وسیم اختر مفتی

---

www.javedahmadghamidi.com
www.almawrid.org

عبدالرؤف

''تحریک مجاہدین، جنگ بالاکوٹ کے بعد''

تصنیف: سید امیر بادشاہ بخاری،

صفحات: ۱۳۹،

قیمت: ۴۰ روپے،

پتا: تاج کتب خانہ، محلّہ جنگی قصہ خوانی پشاور۔

www.javedahmadghamidi.com

www.al-mawrid.org

سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین ہندوستان میں مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کا ایک درخشندہ باب ہے۔ بعد کے زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی انگریزوں کے خلاف چلائی گئی ہر تحریک اس تحریک سے متاثر نظر آتی ہے۔ سید احمد شہید کی تحریک پر علما اور دانش وروں نے بہت کچھ لکھا ہے جن میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا غلام رسول مہر جیسے بلند پایہ اہل قلم شامل ہیں۔ اسی سلسلے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی اور اشتیاق حسین قریشی کے تبصرے بھی سامنے آ چکے ہیں۔ مگر ۱۸۳۱ء میں سید احمد شہید کی شہادت کے بعد اس تحریک کے ساتھ کیا ہوا؟ اس سوال کے جواب کے لیے جتنا کام ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں ہو سکا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ سید احمد شہید کے بعد یہ تحریک قیام پاکستان تک کسی نا کسی صورت میں جاری رہی، بلکہ اس تحریک کے مجاہدین نے پاکستان بننے کے بعد کشمیر کے محاذ پر بھی جنگ لڑ کر قربانیاں دی ہیں۔

زیر نظر کتاب تحریک مجاہدین کے اس دور سے متعلق ہے جب سید صاحب شہید ہوئے تھے اور بچ جانے والے ساتھی مجاہدین نے ہندوستان میں اپنے گھروں کو جانے کے بجائے سرحدی قبائلی علاقوں میں مورچہ بندی کر کے پہلے سکھوں کے خلاف جدوجہد کی اور پھر ۱۸۴۹ء میں انگریزوں کے صوبۂ سرحد پر قابض ہونے کے خلاف گوریلا جنگ جاری رکھی۔ بقول مصنف وہ انگریزوں کی خفیہ دستاویزات ایک اور موضوع ـــــ انگریزوں کی طرف سے صوابی کے علاقے کے خوانین کو جائدادیں کیسے دے دی گئی تھیں؟ ـــــ کے لیے دیکھ رہے تھے کہ اس دوران میں بعض ایسی دستاویزات ان کی نظر سے

گزریں جونہایت اہم تھیں۔اس کے علاوہ مولانا غلام رسول مہر کی کتابیں دیکھ کر یہ تاثر ملتا ہے کہ جیسے سید احمد شہید کی تحریک کی ناکامی میں سب سے بڑا ہاتھ پختونوں کی غداری کا ہے، جبکہ مصنف کے نزدیک صحیح صورت حال یہ ہے کہ اگر ایک طرف پختونوں میں ہنڈ کا خادی خان، پشاور میں سلطان محمد خان اور یار محمد خان درانی جیسے غدار تھے تو دوسری جانب زیدہ کے فتح خان، پشاور کے ارباب بہرام خان اور دوسرے ہزارہا جان باز پختون شامل تھے۔ارباب بہرام خان نے تو سید صاحب کے ساتھ بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کیا۔اسی طرح صوابی کے سید امیر مشہور بہ کوٹھا بابا جی، ستھانہ اور ملکا کے سادات خاندان بھی صوبۂ سرحد میں مجاہدین کے شانہ بشانہ لڑے۔مصنف سوال اٹھاتا ہے کہ اگر صوبہ سرحد کے لوگ مجاہدین کا ساتھ نہ دیتے تو کیا وہ اپنی تحریک ۱۹۴۸ء تک جاری رکھ سکتے تھے۔

کتاب کے مصنف پیشے کے اعتبار سے وکیل ہیں، لیکن وکالت کے ساتھ وہ علمی ذوق بھی رکھتے ہیں۔اس کا اظہار صوابی کے ایک گاؤں میں ان کی ذاتی لائبریری سے ہوتا ہے جس میں اسلام، تاریخ اور سیاسیات کے علاوہ رسائل و جرائد کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ عملی سیاست میں بھی حصہ لیتے رہے ہیں۔انتخابات میں ایک مذہبی سیاسی جماعت کی طرف سے میدان میں اتر چکے ہیں۔مصنف نے کتاب کا انتساب ان وکیل بھائیوں کے نام کیا ہے جو پیشے کے ساتھ ساتھ ''فریضۂ اقامت دین'' کا حق بھی ادا کرتے ہیں اور تحقیق کا کام بھی کرتے ہیں۔کتاب پیش لفظ اور ضمیمہ جات کے علاوہ سات موضوعات پر مشتمل ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کتاب کے پہلے حصے میں انھوں نے جہاد کے موضوع پر بات کی ہے اور بعد میں ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال اور انگریزوں کی آمد اور پھر اس کے بعد دین کے احیا کے لیے تحریکوں کا ذکر ہے جس میں زیادہ زور سید احمد شہید کے کام پر دیا گیا ہے۔کتاب کے باقی موضوعات یہ ہیں: مجاہدین اور کالا ڈھاکہ، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور مجاہدین، جنگ نارنجی اور مجاہدین، مجاہدین منگل تھانے میں، جنگ امبیلہ اور مجاہدین اور جنگ امبیلہ کے بعد۔

مصنف نے اپنی رائے کو مدلل بنانے کے لیے ان لڑائیوں کا ذکر کیا ہے جو ان مجاہدین نے مقامی لوگوں کے تعاون سے انگریزوں کے خلاف لڑی ہیں۔جن میں کالا ڈھاکہ کی مہم کو انگریزوں نے اپنی فوجی تاریخ میں ریکارڈ کیا ہوا ہے۔اسی طرح ۱۸۶۳ء کی امبیلہ جنگ تو برطانوی ہندوستان کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے۔اس جنگ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انگریز کمانڈر انچیف خود اس جنگ کی کمان کرنے کے لیے سرحد آنا چاہتا تھا، مگر بوجوہ نہ آسکا اور وہ لاہور سے اس مہم کی نگرانی کرتا رہا۔مزید یہ کہ اس جنگ میں انگریزوں کی نو ہزار فوج نے حصہ لیا۔جنگ کے اختتام پر دو انگریز افسروں کو تاج برطانیہ کی طرف سے سب سے بڑا فوجی اعزاز وکٹوریہ کراس دیا گیا۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس جنگ نے انگریزوں کو مالی، عسکری اور نفسیاتی طور پر بہت نقصان پہنچایا جس کا اعتراف انھوں نے خود ان الفاظ میں کیا ہے:

".. It is true that, in spite of all opposition, we accomplished our original

object, but the anxiety, the expense, and the losses incurred, were out of all proportion to the end achieved, and our long detention , perhaps rather injured our prestige. In this retrospect, therefore, the Compaign is not altogether staisfactory".(p. 89)

یہی وجہ ہے کہ جنگ کے اختتام پر انھوں نے ہندوستان بھر سے مجاہدین کے لیڈروں جیسے مولانا عبدالرحیم، قاضی میاں جان، میاں عبدالجعفر ،عبدالکریم انبالوی، عبدالغفور، حسین ابن محمد بخش، حسین ابن میغو ، الٰہی بخش ابن کریم بخش اور میاں عبدالغفار کو گرفتار کیا، جبکہ مولانا محمد جعفر تھانیسری، شیخ محمد شفیع، مولانا یحیٰ علی کو گرفتار کر کے پہلے موت کی سزا سنا دی گئی بعد میں ان کو جزائر انڈیمان جلاوطن کر دیا گیا۔اسی طرح ۱۸۶۸ء میں صوبۂ سرحد کی تاریخ میں پندرہ ہزار پر مشتمل انگریزی فوج نے کالا ڈھا کہ مہم میں حصہ لیا۔

مصنف نے تفصیلاً بیان کیا ہے کہ ان مہمات میں مجاہدین کی مدد کرنے پر مقامی لوگوں کو کس کس طرح نقصان پہنچایا گیا، جس میں لوگوں کا معاشرتی مقاطعہ، ملک بدری، مکانات کا جلانا، فصلوں کو تباہ کرنا اور اس کے علاوہ قید و بند کی صعوبتیں دینا شامل ہیں۔

مصنف نے مختلف واقعات کے لیے برطانوی دور کی دستاویزات سے استفادہ کیا ہے اور جگہ جگہ اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ البتہ حوالہ جات میں وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو عموماً تحقیقی نوعیت کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔جس کی وجہ شاید مصنف کا ان طریقوں سے ناواقف ہونا ہے، اسی لیے اکثر حوالے نامکمل ہیں۔مصنف نے مجاہدین کے رہنماؤں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔اس سلسلے میں ان کی معلومات امیر المجاہدین مولوی نعمت اللہ کے بارے میں بہت ناقص ہیں۔ان کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

''ان کو ۱۹۲۲ء میں بعض گم کردہ راہ اشخاص کی سازش سے شہید کیا گیا۔''

ان کی شہادت کا واقعہ اپنی جگہ درست ہے، کیونکہ کسی بھی شخص کو انتہائی خطرناک حالات کے علاوہ عدالت کے فیصلے کے بغیر قتل نہیں کیا جا سکتا۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولوی نعمت اللہ کا اخلاق اور کردار دوسرے مجاہدین رہنماؤں سے بہت مختلف تھا۔ بلکہ ان کی امارت تحریک مجاہدین کے لیے قابل فخر نہیں ہے۔مولوی محمد علی قصوری کی اپنی یادداشتوں پر مشتمل کتاب ''مشاہدات کابل و یاغستان'' میں ان کی خامیوں اور کردار کی کمزوریوں کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔

مولوی نعمت اللہ کا قتل مولوی محمد یوسف نامی شخص نے کیا تھا اور یہ ان پندرہ طالب علموں میں شامل تھا جنھوں نے ۱۹۱۵ء میں لاہور کے مختلف کالجوں سے تعلیم چھوڑ کر افغانستان اور قبائلی علاقہ جات کا سفر کر کے تحریک آزادی میں حصہ لیا تھا۔محمد یوسف نے امیر صاحب کے غلط رویوں اور انگریزوں کے ساتھ معاہدہ سے دل برداشتہ ہو کر ان کے قتل کا فیصلہ کیا اور خود بھی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

کتاب کے سرورق سے بظاہر یوں لگتا ہے کہ یہ تحریک مجاہدین کے جنگ بالاکوٹ کے بعد کے تمام واقعات پر مشتمل ہوگی۔ بلاشبہ، اس میں جنگ بالاکوٹ کے بعد کے واقعات شامل ہیں، لیکن یہ صرف ۱۸۹۱ء تک ہیں۔اس کے بعد اہم واقعات جیسے ۱۸۹۷ء میں پختونوں کی انگریزوں کے خلاف بغاوت اور اس میں مجاہدین کا کردار، ۱۹۱۵ء میں بونیر کے مقام پر لڑائی، مہمند ایجنسی میں چمرکنڈ کے مقام پر مجاہدین کے ایک بہت اہم کیمپ کا قیام اور اس کے دو بڑے اہم رہنماؤں مولوی فضل الٰہی اور مولوی محمد بشیر کا تذکرہ، وزیرستان کے مقام مکین میں مجاہدین کی آمد اور لڑائیوں میں کردار، حاجی صاحب ترنگزئی کے ساتھ تعاون و امداد، ۱۹۱۹ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ میں افغانستان کی حمایت جیسے اہم موضوعات پر مصنف نے تبصرہ نہیں کیا۔اس لیے یہ صرف ۱۸۴۹ء سے ۱۸۹۱ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔

کتاب کی ترتیب و تدوین میں بھی کمی محسوس ہوتی ہے۔عنوانات مناسب انداز سے نہیں دیے گئے ہیں۔اسی طرح اگرچہ ایک مختصر فہرست کتابیات کی بھی ہے، لیکن یہ کتاب کے آخر میں نہیں ہے۔بحیثیت مجموعی مصنف کی جانب سے یہ ایک اچھی کوشش ہے۔خصوصاً دیہاتی ماحول میں بیٹھ کر تحقیقی کتاب لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔مزید یہ کہ مصنف اپنے اس مقصد میں کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں کہ اس غلط فہمی کو دور کریں کہ تحریک مجاہدین میں پختونوں کا کردار منفی رہا ہے۔ تحریک آزادی ہند اور اسلامی تحریکوں میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لیے یہ کتاب مفید ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

O

وہی ہے دہر میں اپنے مقام سے آگاہ ہوا جو لذتِ ذکر دوام سے آگاہ

یہ تیرا علم و محبت ، یہ معرفت ، یہ خیال ہوئے نہ آہ ، خدا کے کلام سے آگاہ

سمجھ ہی لے گی شریعت کا مدعا بھی خرد اگر ہے اپنے حلال و حرام سے آگاہ

ترے جہاں میں غریبوں کی زندگی کیا ہے! نہ اپنی صبح سے واقف ، نہ شام سے آگاہ

وفورِ شوق میں کہہ دی ہے سرگزشت اپنی
وگرنہ آپ ہیں اپنے غلام سے آگاہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org